ذلیل بنانا دین کی کوئی خدمت نہیں ہے۔

مخزن الولایت ۔ مرتبہ منشی ولایت علی عزیز، ترجمہ محمد خصلت حسین صابری، صفحات ۲۰۰، کتابت وطباعت متوسط، ناشر پاک اکیڈمی وحید آباد، ۱۸ کراچی ۱۸، قیمت ہے

بارہویں صدی میں شاہ خادم صفی پوری سلسلہ صفویہ کے ایک بزرگ گذرے ہیں، مخزن الولایت انہی کے فارسی ملفوظات کا اردو ترجمہ ہے، ان کے ملفوظات میں بزرگوں کے ملفوظات کی خصوصیات یعنی محبت الٰہی، خالق ومخلوق سے انس اور درد وسوز بدرجۂ اتم موجود ہے، شروع میں مترجم کے قلم سے ایک پُرمعلومات مقدمہ بھی ہے جس میں شاہ خادم کے حالات اور سلسلۂ صفویہ کی تاریخ کا ذکر ہے، کتاب مطالعہ کے لائق ہے۔

مدرسۂ ابتدائی کی تاریخ حصہ اول ۔ از عبد الغفار مدھولوی، صفحات ۱۶۰، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۲۵

عبد الغفار صاحب مدھولوی جامعہ ملیہ کے اُن اساتذہ میں ہیں جنھوں نے اس کے لیے اپنی زندگی وقف کی اور اس کی تعمیر میں حصہ لیا، جامعہ میں ابتدائی مدرسہ کی ابتدا، اور اس کی ترقی میں ان کا حصہ سب سے نمایاں ہے، انھوں نے اس کی ابتدا، اسکے مختلف شعبوں، اسکی تدریجی ترقیوں اور کاموں کی تفصیل بڑے اچھے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے، ابتدائی درجات میں جو تدریجی ترقیاں ہوتی جاتی تھیں اور جو شعبے کھلتے جاتے تھے ان سب کو جزئی واقعات کے ساتھ عبد الغفار صاحب قلمبند کرتے جاتے تھے، گویا یہ کتاب ان کی ذاتی تعلیمی ڈائری ہے، اس میں محض ابتدائی چار سال یعنی ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک کے تعلیمی کاموں اور ترقیوں کا ذکر ہے، مدھولوی صاحب کا انداز بیان اتنا دلچسپ اور آسان ہے کہ پڑھنے والے کو ذرا بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی، ابتدائی تعلیم کا کام کرنے والوں کے لیے یہ ایک اچھی دستاویز ہاتھ آگئی ہے، اس سے ان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔ یہ کتاب کا پہلا حصہ ہے۔

م - ج

جلد ۹۴ ماہ جمادی الثانی ورجب المرجب ۱۳۸۴ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۶۴ء عدد ۵

مضامین

مقالات

آثار علمیہ وادبیہ

شذرات

دارالمصنفین کی جوبلی دسمبر کے آخری عشرہ میں قریب قریب طے تھی، لیکن اس میں اتنی علمی تعلیمی تقریبات جمع ہوگئیں کہ بہت سے اصحاب علم دارالمصنفین کی جوبلی میں شریک نہیں ہوسکتے تھے، اُن میں سے بعض تقریبوں کا زمانہ میں ہوا اس کے بعد ہی رمضان شروع ہوجاتے ہیں، اس لئے مجبوراً جوبلی کی تاریخ ۲۰، ۲۱ فروری ۱۹۶۵ء تک بڑھا دی گئی، یہ تاریخ آخری ہے اب اس میں انشاء اللہ تبدیلی نہ ہوگی، جوبلی کے مصارف کی فراہمی کیلئے راقم الحروف اور رفیق عزیز سید صباح الدین عبدالرحمن نے بھوپال اور بمبئی کا سفر کیا تھا، اس کیلئے کوئی چندہ نہیں کیا گیا، بلکہ لائف ممبر بنانے کی کوشش کی گئی جس کی فیس ایک ہزار ۱۰۰۰ اور پانسو ۵۰۰ ہے، ایک ہزار کے ممبروں کو دارالمصنفین کی تمام گذشتہ اور آیندہ مطبوعات اور رسالہ معارف اور پانسو کے ممبروں کو دو سو روپئے قیمت کی گذشتہ مطبوعات جن کو وہ پسند کریں اور آیندہ جو مطبوعات طبع ہونگی اور رسالہ معارف پیش کیا جاتا ہے، جس کی قیمت تقریباً فیس ممبری کے برابر ہوجاتی ہے، جو لوگ بغیر کسی معاوضہ کے امداد کرنا چاہتے ہیں، اُس کو قبول کرنے میں بھی تامل نہیں ہوتا، لیکن دارالمصنفین اپنی جانب ہر شخص کی امداد کے معاوضہ میں کچھ نہ کچھ کتابیں پیش کرتا ہے،

بھوپال اور بمبئی خصوصاً بھوپال کے باشندوں نے توقع سے زیادہ پذیرائی کی، اور اس حالت میں جبکہ بھوپال کی ریاست ختم ہوچکی ہے اور وہاں کے مسلمانوں کی پہلی مالی حیثیت باقی نہیں ہے، گیارہ ہزار کی رقم پیش کی، یہ خطیر رقم جسٹس سلام الدین صاحب کی توجہ اور مولانا عمران خانصاحب کی کوشش کا نتیجہ تھی، ان کے علاوہ مدھیہ پردیش کے سابق وزیر جناب عنایت اللہ خانصاحب طرزی مشرقی، سید معشوق علی صاحب، سید یوسف علی صاحب نے بھی اس کام میں بڑی دلچسپی لی، اور اس اعزاز و اکرام کے ساتھ یہ رقم پیش کی گئی کہ ارکان وفد کو کہیں آنا جانا نہیں پڑا، مولانا عمران خانصاحب نے جسٹس سلام الدین صاحب کی توجہ

یہ رقم جلد ہی فراہم کرلی تھی، وفد کے پہونچنے کے بعد تاج المساجد میں ایک عصرانہ کیا جس میں تمام عمائد شہر شریک تھے، اور دارالمصنفین کے خدمات پر تقریر کے بعد گیارہ ہزار کی رقم پیش کردی، سید صباح الدین صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا، اس سلسلہ میں تاج المساجد کے احاطہ میں دارالمصنفین کی کتابوں اور اس کے بعض نوادر کی نمائش بھی ہوئی، ان تمام مراحل میں مولانا عمران خاں کا حسن انتظام و جدت مندی نمایاں تھی،

والیۂ بھوپال نواب ساجدہ سلطانہ بالقابہا نے نہ صرف خود لائف ممبری قبول فرمائی بلکہ اپنے صاحبزادہ نواب پٹودی اور شہزادہ عفان کو بھی لائف ممبر بنایا، اس طرح سب سے بڑی مدد اسی دربار سے ملی جس کی امداد سے دارالمصنفین کی بنیاد پڑی تھی، اسکے شکریہ کیلئے علیا حضرت کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، موصوفہ میں سادگی، وقار اور اسلامی حمیت کی وہی خصوصیات نظر آئیں جو ان کی جدہ مرحومہ خلد آشیاں میں تھیں، اُن کی سادگی اور متانت کا دل پر خاص اثر پڑا، دارالمصنفین ان تمام محسنوں کا شکرگذار ہے،

بمبئی کے باشندوں نے بھی ہماری آواز پر لبیک کہا، پچیس ہزار کی رقم نقد وصول ہوچکی ہے، اور مزید کی توقع ہے، اس کا سہرا سیٹھ عبدالعزیز صاحب انصاری اعظمی اور سید شہاب الدین صاحب دیسنوی پرنسپل صابو صدیق ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کے سر ہے، ان دونوں مخلصوں نے اپنی مشغولیتوں کے باوجود اس کام میں بڑا وقت صرف کیا، اور اپنے حلقہ اثر میں لائف ممبر بنانے کی کوشش کی، انصاری صاحب نے جن کا دولت کدہ ایک مستقل مہمانخانہ ہے، اپنی روایتی فیاضانہ میزبانی کا فرض بھی انجام دیا، دیسنوی صاحب نے ایک پرتکلف دعوت کی، ان محسنوں کے علاوہ آصف فیضی صاحب، سید نجیب اشرف صاحب ندوی، محمد حارث صاحب جامعی ایڈیٹر اجمل، پرنسپل ضیاء الدین صاحب، سیٹھ احمد ماچس والا، سیٹھ احمد غریب صاحب، سید حامد علی صاحب زاہد، شوکت علی صاحب، مولوی مختار احمد صاحب ندوی نے بھی بڑی دلچسپی لی، اور ابھی انصاری صاحب اور دیسنوی صاحب کی کوششوں کا سلسلہ جاری ہے،

ان دونوں مخلصوں نے خدام دارالمصنفین کے اعزاز میں انجمن اسلام ہائی اسکول کی شاندار عمارت کے وسیع ہال میں فیضی صاحب کی صدارت میں ایک جلسہ کیا، جس میں بمبئی کے بہت سے عمائد اور اصحاب علم شریک تھے، فیضی صاحب اور دیسنوی صاحب نے دارالمصنفین کے خدمات پر تقریر کی، سید صباح الدین صاحب نے اس کا جواب دیا، اور چائے کی

پرتکلف دعوت کے بعد یہ جلسہ ختم ہوا، اس جلسہ میں بھی دارالمصنفین کی مطبوعات اور نوادر کی نمائش ہوئی جس کو اسکول کے اسٹاف نے بڑی خوش اسلوبی سے آراستہ کیا تھا، انجمن ترقی اردو بمبئی نے بھی ازراہِ علم نوازی ایک ٹن صابو صدیق ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ میں چائے کی دعوت سے نوازا جس میں بمبئی کے بہت سے اہلِ علم و قلم شریک تھے اس کے لائق سکریٹری جناب اعجاز احمد صاحب ڈیر شاعر نے اپنی تقریر میں دارالمصنفین کی خدمات کو سراہا، اس کا جواب سید صباح الدین صاحب نے دیا، اعجاز صاحب کا یہ کمال ہے کہ ادیب شاعر ہونے کے باوجود انھوں نے بمبئی کی شعر و موسیقی کی دنیا میں بھی اپنا علمی وقار قائم رکھا اور اس کو فلمی دولت اور شہرت پر قربان نہیں کیا، جماعت اہل حدیث نے بھی چائے کی دعوت کر عزت افزائی کی، دارالمصنفین کے پرانے مخلص اور مشہور اہلِ قلم جناب عبدالرزاق صاحب قریشی نے انجمن اسلام ہائی اسکول کی عمارت میں ایک پرتکلف عصرانہ دیا جس میں اسکول کے بہت سے اساتذہ شریک تھے، رائل میں ہسپیم کے کارکنوں نے بھی دعوت طعام سے تواضع کی،

ایک شبانہ یوم بمبئی کی پرشور زندگی سے دور برادر محترم سید نجیب اشرف صاحب ندوی کے یہاں اندھیری کے گوشہ عافیت میں بسر کئے، اس کا افسوس ہے کہ ہمارے ایک مخلص قاضی اطہر صاحب مبارک پوری تعطیل کی وجہ سے وطن چلے آئے تھے، جس کی بڑی کمی محسوس ہوئی، اور ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے بھیونڈی کا سفر نہ ہوسکا لیکن ہم کو یقین ہے کہ وہ اس کی تلافی کی کوشش کریں گے، بمبئی سے واپسی میں جوبلی کے متعلق بعض معاملات پر ڈاکٹر ذاکر صاحب سے گفتگو کرنے کے لئے دو دن دہلی میں قیام رہا، موصوف نے بھوپال اور بمبئی کی کامیابی کا حال سُن کر بڑی ہمت افزائی کی، اور چلتے وقت ڈھائی ہزار کتب خانے کے لئے مرحمت فرمائے، سفر سے واپسی میں اندازہ سے زیادہ تاخیر ہوگئی، اس لئے روداد سفر لکھنے کے لئے معارف کی اشاعت میں مجبوراً دو چار دن کی تاخیر کرنی پڑی، آئندہ مہینہ میں ہم لائف ممبروں کے نام اور دوسری ضروری باتیں لکھیں گے، امید ہے کہ ناظرین معارف اس معمولی تاخیر کو گوارا فرمائیں گے،

مقالات

ملفوظاتِ خواجگانِ چشتؒ

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے

(۲)

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مجموعۂ ملفوظات دلیل العارفین پر پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس کی مجلسِ اول کی تاریخ ۵۱۴ھ لکھی ہوئی ہے، جو غلط اس لیے ہے کہ اس وقت تک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی پیدائش بھی نہیں ہوئی تھی، لیکن یہ کتابت کی اسی طرح کی غلطی ہے جس طرح کہ سیر الاولیاء (ص ۸۴) میں ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدینؒ ۵۲۲ھ میں حضرت خواجہ معین الدینؒ سے بیعت ہوئے، جب کہ حضرت خواجہ کی پیدائش ۵۳۰ھ میں بتائی جاتی ہے یا فرشتہ جیسے دیدہ ور مورخ کی تاریخ (جلد دوم ص ۳۷۷) میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدینؒ سنہ ۵۶۱ھ میں اجمیر تشریف لائے جبکہ وہاں سید حسین مشہدی المشہور بہ خنگ سوار قطب الدین ایبک کی طرف سے داروغہ تھے، حالانکہ قطب الدین ایبک دہلی کا سلطان ۶۰۲ھ میں ہوا۔

دلیل العارفین میں ایک روایت کے سلسلے میں یہ لکھا گیا ہے

”گفت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امروز قریب چہل سال است کہ نماز می گزاردم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چشم پر آب کردہ فرمود کہ ہیچ نماز نکردہ“

اس پر اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو چالیس سال کی مدت نہیں ملی، اس لیے آپ کے سامنے یہ کیسے کہا گیا کہ چالیس سال سے نماز پڑھ رہا ہوں، یہ اعتراض صحیح ہے لیکن چہل سال یقیناً کتابت کی غلطی ہے، یہ چہار یا چندیں سال ہے، کاتب کو چندیں سال، چہار سال اور چہل سال لکھنے میں تسامح ہو گیا ہے،

دلیل العارفین کی بارہویں مجلس میں روایت ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی وفات سے بیس روز پہلے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اجمیر چھوڑ کر دہلی آئے اور یہاں انھوں نے کل چالیس روز قیام کیا تھا کہ ان کی وفات کی خبر آئی، پروفیسر موصوف کا یہ کہنا ہے کہ یہ بیان صحیح نہیں ہے، کیونکہ اخبار الاخیار کی روایت کے مطابق حضرت خواجہ معین الدینؒ کا وصال رجب ۶۳۳ھ میں ہوا، اور ان سے پہلے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی وفات اسی سال ۱۴ ربیع الثانی میں ہو چکی تھی، لیکن یہ اعتراض اسی وقت صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ اخبار الاخیار میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی جو تاریخ وفات لکھی گئی ہے، اس کو قطعی اور آخری سمجھ لیا جائے، راقم کی تحقیق ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی وفات حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے پہلے ۶۲۷ھ میں ہوئی، گو زیادہ تر تذکرہ نویس ان کے وصال کی تاریخ ۶ رجب ۶۳۲ھ لکھتے ہیں، اگر ۶۲۷ھ یا ۶۳۲ھ ان کی تاریخ وفات تسلیم کر لی جائے تو پھر یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا وصال حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی وفات سے پہلے ہوا، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی وفات کی تاریخ ۱۴ ربیع الثانی ۶۳۳ھ بالاتفاق تسلیم کی گئی ہے، اس لحاظ سے دلیل العارفین کی مجلس یازدہم میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کوئی پیچیدگی یا تضاد نہیں ہے۔

دلیل العارفین (ص ۲۳) میں جامع الحکایت کا حوالہ ہے، اعتراض ہے کہ محمد عوفی کی جامع الحکایات فی الروایات ساتویں صدی ہجری کی تصنیف ہے، اس لیے دلیل العارفین میں اس کا حوالہ دینا تعجب خیز ہے،

جامع الحکایت کو محمد عوفی کی جامع الحکایات فی الروایات تسلیم کر لینا اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ دلیل العارفین میں جو روایت لکھی گئی ہے وہ عوفی کی جامع الحکایات میں بھی موجود ہو، میری نظر سے دلیل العارفین کی روایت عوفی کی جامع الحکایات میں نہیں گذری، اس سے قطع نظر دلیل العارفین میں عوفی کی جامع الحکایات کا حوالہ کوئی تعجب خیز نہیں، کیونکہ محمد عوفی کی وفات ۶۳۰ھ میں ہوئی جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ کتاب ۶۳۰ھ سے پہلے لکھی جا چکی تھی، اس لحاظ سے اگر حضرت خواجہ کی نظر سے گذری تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

دلیل العارفین میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زبانی روایت ہے:

"مولانا رضی الدینؒ گھوڑے پر سے گر گئے، ان کا پاؤں ٹوٹ گیا، گھر آئے تو سوچا کہ یہ بلا کہاں سے آئی، ان کو یاد آیا کہ فجر کی فرض نماز کے بعد وہ سورہ یٰسین پڑھا کرتے تھے، اس وقت یہ وظیفہ فوت ہو گیا"

یہی روایت راحۃ القلوب (ص ۲۲) میں بھی حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی زبانی بیان کی گئی ہے، اس میں نام مولانا رضی الدین کے بجائے قاضی رضی الدینؒ مرقوم ہے، لیکن فوائد الفواد کی اس روایت میں نام مولانا عزیز زاہد لکھا ہوا ہے،

"فرمود کہ مولانا عزیز زاہد رحمۃ اللہ علیہ یکروز از اسپ خطا کرد و بازوی او فرود آمد از و پرسید چہ حالت اگفت کہ من ہر روز سورہ یٰسین می خواندم، امروز نخواندہ ام (ص ۱۰۰)

سیر الاولیا میں یہی روایت لفظ بہ لفظ نقل کر دی گئی ہے، صرف مولانا عزیز زاہد کے بجائے اس میں مولانا عزیز الدین زاہدؒ لکھا ہے۔

پروفیسر محمد حبیب کا اعتراض ہے کہ دلیل العارفین کی یہ روایت فوائد الفواد سے سرقہ ہے، صرف نام بدل دیا گیا ہے، یہ بھی اعتراض ہے کہ دلیل العارفین کے گمنام مرتب نے مولانا کمال الدین زاہدؒ

کو مولانا رضی الدین صغانی سے خلط ملط کر دیا ہے، پروفیسر صاحب نے مولانا رضی الدین کے نام کے ساتھ صغانی بڑھا دیا ہے، حالانکہ دلیل العارفین میں صغانی نہیں ہے، اور پھر فوائد الفواد میں مولانا کمال الدین زاہد کا نام نہیں، اس میں مولانا عزیز زاہد ہے، جس کو سیر الاولیاء نے مولانا عزیز الدین زاہد لکھا ہے، اس کو سرقہ کہنا صحیح نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے بزرگان دین فجر کی نماز کے بعد سورہ یٰسین کی تلاوت کا بڑا التزام رکھتے تھے، اس کے فوت ہو جانے پر مولانا رضی الدین یا مولانا عزیز الدین زاہد کو جو حادثہ پیش آیا اس کا ذکر پہلے تو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، پھر حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ اور پھر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے اس کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے کیا، ممکن ہے کہ فوائد الفواد میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی روایت بیان یا اس کو قلمبند کرتے وقت نام لکھنے میں وہی سہو ہو گیا جو خود پروفیسر صاحب کو ہو گیا ہے، انھوں نے عزیز زاہد کو کمال زاہد اور مولانا رضی الدین کو مولانا رضی الدین صغانی تسلیم کر لیا ہے،

دلیل العارفین کی مجلس یازدہم میں ہے:

"فرمود کہ در ملتان بودم، از بزرگے شنیدم کہ توبہ اہل محبت بر سہ نوع است۔"

اعتراض یہ ہے کہ اس میں ملتان کا ذکر کیسے آیا، جب کہ ان ملفوظات کی ترتیب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہندوستان میں آنے سے پہلے بغداد میں ہوئی، لیکن یہ سمجھنا کہ یہ تمام ملفوظات بغداد میں مرتب ہوئے، صحیح نہیں، کیونکہ دلیل العارفین کی مجلس دوازدہم اجمیر کی جامع مسجد میں ہوئی، پھر جہاں ذکر ہے کہ "در ملتان بودم" اسی کے بعد یہ بھی ہے کہ

"مسافری شوم جائیکہ دفن ما خواہد بود، یعنی در اجمیر می روم، ہر کسے را وداع کرد و دعا گو بر در راہ بودیم، بعد ازاں در اجمیر رسیدیم۔" (ص ۵۴)

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ نے اجمیر سے پہلے ملتان میں قیام کیا، جہاں ان کی ملاقات کسی بزرگ سے ہوئی، اس کا ذکر مجلس یازدہم کے بجائے علٰحدہ ہونا چاہیے تھا، لیکن ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، اس تصنیفی ترتیب کے نہ ہونے کی وجہ سے واقعہ کی اصلیت میں فرق نہیں آنے پاتا۔

دلیل العارفین (ص ۵۵) میں ہے:

"آنگاہ فرمود کہ مرتبہ اہل محبت چنانست کہ اگر پسند شب نماز گزار دی، گوید کہ ما را فراغت نیست و ملک الموت می گردیم و ہر جا کہ در ماندہ است او را دست می گیریم۔"

اس ملفوظ میں موت کی جو خوفناکی دکھائی گئی ہے اس کو تصوف کے اداشناس ہی سمجھ سکتے ہیں، پروفیسر صاحب اس کو پست درجہ کا تصوف (degrading type of mysticism) کہتے ہیں، لیکن حسب ذیل تحریروں میں اسی قسم کی باتیں ملیں گی،

"ایک مرید ہے جو پانچوں وقت نماز پڑھتا ہے، تھوڑے اوراد بھی پڑھ لیتا ہے، لیکن اپنے شیخ کی محبت اس کے دل میں بہت ہے اور پیر سے بڑا راسخ اعتقاد رکھتا ہے، دوسرا مرید وہ ہے کہ عبادت بہت کرتا ہے، بے حد تسبیح اور اوراد پڑھتا ہے، اس نے حج بھی کیا ہے، لیکن شیخ کی محبت میں کمی کرتا ہے، اور اس کے پیر سے اعتقاد رکھنے میں فتور ہے، تو ان دونوں مریدوں میں سے کون بہتر ہے۔ فرمایا جو اپنے پیر سے محبت کرتا ہے اور اس کا معتقد ہے۔" (فوائد الفواد ص ۱۲۰)

(شیخ نصیر الدین دہلویؒ نے) فرمایا کہ خواجہ ممشاد دینوری رحمۃ اللہ علیہ بستر علالت پر تھے، ان پر سخت وقت گزرا، تو اس وقت مریدوں میں سے ایک نے ہاتھ اٹھایا اور دعا کی کہ خداوندا! خواجہ ممشاد کو بہشت عنایت کرنا، خواجہ ممشاد نے...... آنکھ کھولی اور فرمایا یہ دعا تم میرے لیے کرتے ہو، چالیس سال سے بہشت مجھکو دی جا رہی ہے، لیکن میں اس کی طرف گوشۂ چشم سے بھی نہیں دیکھتا ہوں۔"

(خیر المجالس ص ۲۳۴)

فوائد السالکین پر جتنے اعتراضات ہیں وہ اور بھی زیادہ کمزور قسم کے ہیں، ایک اعتراض یہ ہے
کہ اگر حضرت فریدالدین گنج شکرؒ نے اس کو مرتب کیا تو وہ فوائد الفواد میں اس کا ذکر ہوتا، لیکن
اس کا ذکر نہ ہونا اس کے فرضی ہونے کی کوئی قوی دلیل نہیں ہے، حضرت نظام الدین اولیاؒ
نے اپنے دوسرے مجموعۂ ملفوظات افضل الفوائد میں اس کا ذکر کیا ہے، تو وہ قابل اعتنا ہی
نہیں سمجھا جاتا ہے، البتہ اس میں ۵۸۴ھ کی جو تاریخ لکھی گئی ہے، وہ کتابت کی غلطی معلوم
ہوتی ہے، جس کو فاضل معترض نے بھی تسلیم کیا ہے،

فوائد السالکین (مجلس دوم ص ۱۳) میں ہے:

"ہمدریں محل فرمود کہ وقتے من و قاضی حمید الدین ناگوری طواف خانہ کعبہ می کردیم، ازبزرگے
بود، او در انجا شیخ ... ہمان گفتندے و او از بندگان خواجہ ابوبکر شبلی بود......"

اس پر یہ اعتراض صحیح ہے کہ ابوبکر شبلیؒ اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے زمانہ میں
بڑا فرق ہے، اس لیے ان کے حج کے زمانے میں بندگان خواجہ ابوبکر شبلیؒ کا ہونا ممکن نہیں،
بندگان کتابت کی غلطی ہے، اس کے بجائے نبیسگان ہونا چاہیے، پھر خواجہ ابوبکر شبلیؒ کے
نبیسگان (پوتے پڑپوتے) میں سے کسی کا ہونا کوئی بعید از قیاس نہیں، اسی طرح حسب ذیل
عبارت میں کتابت کی ایک ایسی غلطی رہ گئی ہے، جس پر اعتراض کرنا محض خردہ گیری ہے،

"ہمدریں محل فرمود کہ وقتے بخدمت شیخ معین الدین حسن سجزی نشستہ بودم، در اجمیر
پتھورا کافر زندہ بود، ہر باری گفت چہ نیکو بود کہ ایں درویش ازینجا برود درویش
ہر کہ بودے گلہ می کردے، چنانچہ ایں خبر بسمع شیخ معین الدین چشتیؒ رسید درویشاں
دیگر نشستہ، درحال متفکر بود، سر در مراقبہ کرد، در مراقبہ فریاد کرد، پتھورا را
زندہ بمسلمانان دادیم، ہمدریں چند روز لشکر سلطان شمس الدین محمد شاہ آنجا رسید

تمام شہر را نہیب کرد و پتھورا را زندہ گرفت و رواں شد......" (ص ۱۵)

اوپر کی عبارت میں سلطان شمس الدین محمد شاہ کے بجائے سلطان معزالدین محمد بن سام
ہونا چاہیے، اس کے بعد پوری عبارت پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا، سلطان شمس الدین محمد شاہ
کا لکھا جانا کتابت وطباعت کی غلطی ہے جس کی نشاندہی تاریخ کا ایک ادنیٰ درجہ کا طالب علم
بھی کر سکتا ہے۔

فوائد السالکین میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی زبانی روایت ہے کہ "میں قاضی
حمید الدین ناگوریؒ کے ساتھ شیخ علی سجزیؒ کی خانقاہ میں تھا، وہاں سماع تھا، قوالوں نے
ایک قصیدہ کا یہ شعر پڑھا،

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را — ہر زماں از غیب جانے دیگر است

میرا اور قاضی حمید الدینؒ پر اس شعر کا یہ اثر ہوا کہ تین رات دن مدہوش اور متحیر رہے، اس کے
بعد ہم دونوں گھر آئے، قوالوں سے یہی شعر پڑھواتے تھے، تین متواتر رات اور دن اس شعر پر کھوئے
رہے، ہم لوگ اپنی خبر نہ رکھتے تھے، لیکن نماز وقت پر ادا کرتے تھے، پھر سماع میں مشغول ہو جاتے
تھے، اس طرح سات رات اور دن حیرت میں رہے، قوال جب یہ شعر گاتے تو ایسی حالت اور
حیرت پیدا ہو جاتی کہ اس کی شرح نہیں ہو سکتی ہے۔" (ص ۱۸)

اس روایت میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ اس تحیر کی کیفیت میں حضرت خواجہ قطب الدین
بختیار کاکیؒ کا وصال ہو گیا، اس کی تصریح فوائد الفواد میں ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ
کی زبانی روایت ہے کہ شیخ علی سجزیؒ کی خانقاہ میں سماع تھا، شیخ الاسلام قطب العالم حضرت
خواجہ قطب الدین بختیار دوشی قدس اللہ سرہ العزیز وہاں موجود تھے، قوالوں نے ایک قصیدہ شروع
کیا، اور جب یہ شعر پڑھا ؎

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

تو شیخ الاسلام قطب العالم حضرت خواجہ قطب الدین نور اللہ مرقدہ کو اس پر وجد آگیا، وہاں سے گھر آئے تو مدہوش اور متحیر تھے، فرماتے کہ وہی شعر پڑھو۔ وہ پڑھا جاتا، وہ اسی طرح متحیر رہتے جب نماز کا وقت آتا نماز پڑھتے، اور پھر وہی شعر پڑھواتے، جس کو سن کر ان پر حال اور حیرت طاری ہو جاتی، چار رات دن یہی حال رہا، پانچویں رات رحلت فرمائی، شیخ بدرالدین غزنوی فرماتے ہیں کہ میں اس رات وہاں موجود تھا۔" (ص ۱۴۴)

فوائد السالکین پر اعتراض ہے کہ اس کی اکثر روایتیں فوائد الفواد سے سرقہ ہیں، اگر مذکورۂ بالا روایت بھی سرقہ ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سلسلہ میں رحلت کا ذکر فوائد السالکین میں کیوں حذف کر دیا گیا ہے، سیر الاولیا، سیر العارفین، اخبار الاخیار اور دوسرے تذکروں میں فوائد الفواد ہی کی روایت نقل کی گئی ہے، فوائد السالکین اور فوائد الفواد دونوں میں یہ روایت حضرت خواجہ قطب الدینؒ کی وفات کے سلسلہ میں نہیں بلکہ کیفیت تحیر کے سلسلہ میں لکھی گئی ہے، دونوں میں فرق یہ ہے کہ فوائد الفواد میں ہے کہ اسی حال میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی رحلت ہو گئی، لیکن فوائد السالکین کی روایت کے مطابق اس موقع پر قطب صاحبؒ کی رحلت نہیں ہوئی، فوائد الفواد کی روایت زیادہ مستند سمجھی گئی ہے، لیکن محض اس اختلاف سے فوائد السالکین جعلی قرار دیے جانے کے لائق نہیں ہے، خیر المجالس اور جوامع الکلم جیسی مستند کتابوں میں بھی ایک روایت کو مختلف طریقے سے بیان کیا گیا ہے، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بھی خیر المجالس کے دیباچہ میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ جوامع الکلم میں بہت سی ایسی روایتیں ہیں جو خیر المجالس میں بھی ہیں، اور بعض روایتوں کی تفصیلات میں اہم اختلافات ہیں۔

فوائد السالکین میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی زبانی ہے کہ ہم لوگ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی مجلس میں حاضر تھے۔ بغداد میں کئی روز تک ان کے ساتھ افطار کیا، میں نے ان کی مشغولیت دیکھی، میں نے دنیا کی اتنی سیاحت کی لیکن شیخ شہاب الدینؒ جیسا کوئی آدمی مشغول نہیں دیکھا (ص ۲۲)۔ پروفیسر صاحب نے حضرت خواجہ قطب الدین اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی ملاقات کو مہمل (absurd) قرار دیا ہے، لیکن وجہ نہیں بتائی ہے، حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی وفات ۶۳۲ھ میں ہوئی، قطب صاحب اور ان کا زمانہ ایک تھا۔ فوائد الفواد (ص ۲۱۲) میں سلطان شمس الدین التمش کے ذکر میں ہے کہ وہ بھی شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور شیخ اوحد کرمانی سے ملا، پھر قطب صاحب کی ملاقات کو بعید از قیاس سمجھکر مہمل کیسے قرار دیا جا سکتا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کو تسلیم ہی نہ کیا جائے کہ انھوں نے سیاحت کی لیکن ان کی سیاحت سے انکار کرنا خود اپنی جگہ تعجب خیز ہے، اگر وہ گوشہ نشینی کی طرف مائل ہوتے تو اوش چھوڑ کر اجمیر نہ آتے اور دہلی میں آکر قیام پذیر نہ ہوتے، پھر ان کے مرشد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ برابر متحرک رہے، اس لیے ان کی سیاحت کا دائرہ بہت وسیع رہا، مرشد کی روایت کے مطابق انھوں نے بھی مختلف مقامات کی سیاحت کی تو اس کو یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، فوائد السالکین میں غزنین، سمرقند، بغداد کی سیاحت کے علاوہ خانۂ کعبہ کی زیارت کا بھی جا بجا ذکر ہے، لیکن سیر الاولیاء کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کبھی حج نہیں کیا، اس کے مؤلف نے حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی زبانی یہ بیان کیا، جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے۔

شیخ الشیوخ العالم فرید الحق والدین قدس سرہٗ چند بار آرزوے حج کرد و رواں شد بعدے کہ در او چہ رسید در دل مبارک شیخ شیوخ العالم گذشت کہ شیخ من شیخ قطب الدین بانجم

بختیار قدس سرہ ح: گروہ است مرا چرا باید کرد کہ مخالفت پیر کنم از آنجا کہ باز گشت"۔

اگر یہ روایت شک و شبہ سے بالاتر اس لیے ہے کہ یہ سیر الاولیاء جیسے مستند تذکرہ
کی روایت ہے تو پھر اس کے ان بیانات کو بھی تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیے جس میں
یہ کہا گیا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدینؒ اور حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے ملفوظات مرتب ہوئے،
جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔

فوائد السالکین کی حسب ذیل روایت علمائے ظاہر کی نظر میں کھٹکتی ہے، اس لیے راقم بھی
اس کو الحاقی سمجھتا رہا،

"فرمایا کہ میں حضرت شیخ معین الدین کی خدمت میں حاضر تھا، دوسرے درویش بھی تھے،
اولیاء اللہ کا ذکر ہو رہا تھا، اتنے میں ایک شخص باہر سے آیا، اور بیعت کے لیے قدمبوسی
کی، حضرت خواجہ نے فرمایا، بیٹھ جاؤ، وہ بیٹھ گیا، اس نے کہا کہ آپ کی خدمت میں
مرید ہونے کے لیے آیا ہوں، انھوں نے فرمایا میں جو کچھ تم سے کہوں کرو، اور بجا لاؤ،
تو پھر مرید کروں گا، اس نے کہا جو حکم ہو، فرمایا کہ تم تو کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھتے ہو، لیکن
ایک بار اس طرح پڑھو لا الٰہ الا اللہ چشتی رسول اللہ، وہ راسخ العقیدہ تھا اس لیے
اس نے اسی طرح کلمہ پڑھ دیا، حضرت خواجہ نے اس کو بیعت کر لیا، خلعت اور بہت کچھ
نعمت عطا کی، لیکن اس آدمی سے کہا، سنو، میں نے تم سے اس طرح کلمہ پڑھایا تاکہ
تمھاری عقیدت کا امتحان لوں، ورنہ میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں اور کون ہوں، محمد
رسول اللہ کا کمترین غلام ہوں اور کلمہ وہی ہے جو تم نے پڑھا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
مرید کو صادق ہونا چاہیے، .... (ص ۴۲-۴۳)

لیکن اسی قسم کی روایت فوائد الفواد (ص ۲۳۱)، سیر الاولیاء (ص ۳۴۸) اور مفتاح العاشقین (ص ۴)

میں بھی نظر سے گذری، صرف نام بدلا ہوا ہے، فوائد السالکین میں شیخ معین الدین کا اسم گرامی ہے،
اور ان تینوں کتابوں میں شیخ شبلی کا نام ہے، ان روایتوں کو دیکھ کر فوائد السالکین کی روایت کو
الحاقی سمجھنے سے رجوع کیا، اور خیال ہوا کہ متابعت پیر کے سلسلہ میں صوفیہ کرام کے حلقہ میں اس قسم کی
روایتوں کا بیان کرنا عام تھا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ جب یہ روایت الحاقی
نہیں ہو سکتی ہے تو پھر ان ملفوظات میں سب ہی روایتیں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہو سکتی ہیں، جن کے
رموز و نکات کو یہ بزرگان دین ہی سمجھ سکتے تھے، فوائد السالکین کی حسب ذیل روایت بھی
عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے۔

"حج کا ذکر آیا، قاضی حمید الدین ناگوری، مولانا علاء الدین کرمانی، سید نور الدین مبارک
غزنوی، سید شرف الدین، شیخ محمود موزہ دوز، مولانا فقیہ خداداد اور دوسرے لوگ تھے،
یہ سب ایسے تھے جن کے درمیان عرش سے لیکر تحت الثریٰ تک کوئی خبر باعث حجاب نہ تھی،
سب صاحب کشف و کرامات تھے، خانہ کعبہ کے مسافروں کا ذکر ہونے لگا، خواجہ قطب الاسلام
نے فرمایا جو اللہ کے خاص بندے ہیں، جب وہ اپنے مقام پر ہوتے ہیں تو خانہ کعبہ کو حکم دیا جاتا ہے
کہ ان کے گرد طواف کرے، یہ کہہ کر وہ اور دوسرے حاضرین کھڑے ہو گئے، اور عالم تحیر میں
ایسے مشغول ہوئے کہ اپنے آپ کی خبر نہ رہی، یہ دعا گو بھی عالم شوق میں مستغرق ہو گیا، پھر
حضرت خواجہ اور دوسرے لوگوں نے اسی طرح تکبیریں کہنی شروع کریں جس طرح طواف
کعبہ کے وقت کہا کرتے ہیں، اور ہر ایک کے جسم سے خون ٹپک رہا تھا، اور جو قطرہ زمین
پر گرتا تھا، اس سے تکبیر کا نقش بنتا چلا جاتا تھا، اور جب ہم ہوشیار ہوئے تو ہم نے کعبہ کو
اپنے آگے دیکھا، چنانچہ ہم نے اس کا وہی ادب و تعظیم کیا جو ہونا چاہیے، اس کے بعد ہم نے
چار بار طواف کیا، غیب سے ندا آئی، اے عزیزو! ہم نے تمھارا حج، طواف اور نماز قبول کی۔

اور ان لوگوں کو بھی جو تمھارے نقش قدم پر چلیں اور تمھاری پیروی کریں۔"

"پھر فرمانے لگے کہ شیخ الاسلام معین الدین حسن سجزی قدس اللہ سرہ العزیز ہر سال اجمیر سے زیارت خانۂ کعبہ کے لیے جایا کرتے تھے، رات وہاں گزارتے اور صبح ہونے بھی نہیں پاتی کہ واپس ہو جاتے اور جماعت خانہ میں نماز ادا کرتے، پھر فرمایا کہ میں نے شیخ معین الدین کی زبان سے شیخ عثمان ہارونی کی یہ حکایت سنی کہ جب خواجہ مودود چشتی کو خانۂ کعبہ کی زیارت کا شوق غالب ہوتا تو فرشتوں کو حکم ہوتا کہ خانہ کعبہ کو چشت لے آئیں اور خواجہ کی نظروں کے سامنے کر دیں، خواجہ خانۂ کعبہ کا طواف کرتے، نماز پڑھتے تو فرشتے خانۂ کعبہ کو لے جاتے پھر فرمایا کہ خواجہ حذیفہ مرعشی قدس اللہ سرہ العزیز سترہ برس تک اپنے سجادہ سے نہیں اٹھے اور کہیں نہیں گئے لیکن جو مسافر اور حاجی خواجہ کی زیارت کو آتے کہتے کہ انھوں نے خواجہ کو خانۂ کعبہ اور بیت المقدس میں دیکھا ہے۔" (ص ۲۶-۲۵)

لیکن اس قسم کی روایتوں سے پورے مجموعہ کو جعلی اور فرضی قرار دینا صحیح نہیں، کیونکہ سیر الاولیاء میں اس سے زیادہ عجیب و غریب روایتیں ہیں، ملاحظہ ہوں:۔

"مولانا بدرالدین بڑے صادق القول تھے، ان کی روایت ہے کہ میں نے ایک روز سلطان المشائخ کی دہلیز کے پاس ایک اونٹ دیکھا، وہ دریچہ سے باہر دریچہ کے نیچے کھڑا تھا، سلطان المشائخ اس اونٹ پر سوار ہوئے، اونٹ ہوا میں اڑ گیا، میں بے خود ہوا، اور کچھ دیر کے بعد جب اپنے آپے میں آیا، نیند جاتی رہی (خواب از سرم رفت) یہاں تک کہ رات آخر ہو گئی، پھر میں نے دیکھا کہ وہ اونٹ آگیا ہے، اور دریچہ کے نیچے کھڑا ہے، سلطان المشائخ نے دریچہ کھولا اندر چلے گئے اور اونٹ واپس ہو گیا، اس کاتب حروف نے ثقہ لوگوں سے سنا ہے کہ شیخ نجم الدین صفاہانی ساٹھ سال تک خانۂ کعبہ کے

مجاور تھے، انھوں نے اپنا گھر اس طرح بنایا تھا کہ وہاں سے بیٹھے خانۂ کعبہ کو دیکھا کرتے تھے، بڑے کامل حال شیخ تھے، ایک روز مکہ کے مجاوروں نے ان سے پوچھا کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ سلطان المشائخ مقتدائے عالم ہیں اور خدا کے بندوں کو ان کے مقصد تک پہنچا دیتے ہیں، لیکن خانہ کعبہ کی زیارت نہیں کرتے ہیں اور حج کی دولت نہیں پاتے ہیں، شیخ نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ اکثر فجر کی نماز خانہ کعبہ میں آکر پڑھتے ہیں اور ہم لوگوں کے ساتھ جماعت میں شریک ہوتے ہیں۔" خیال ہے کہ وہ اونٹ فرشتہ تھا جو غیب سے آتا اور سلطان المشائخ کو خانہ کعبہ لے جاتا۔" (ص ۱۴۴-۱۴۳)

آگے چل کر سیر الاولیا کی ایک دوسری روایت یہ بھی ہے

"ایک عزیز نے بیان کیا کہ میں اپنے قصبہ سے سلطان المشائخ کی زیارت کے لیے روانہ ہوا، میرا گذر قصبہ بوندی سے ہوا، میرے دل میں یہ خیال ہوا کہ یہاں ایک بزرگ ہیں جو شیخ مومن کہلاتے ہیں، ان سے جا کر ملاقات کروں، ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے فرمایا کہ تم کہاں جاؤ گے میں نے کہا حضرت سلطان المشائخ کے پاس، انھوں نے کہا سلطان المشائخ سے میرا سلام پہنچانا اور کہنا کہ جمعہ کی ہر رات کو ان سے کعبہ میں ملاقات کرتا ہوں، جب میں سلطان المشائخ کے پاس پہنچا تو عرض کیا، قصبہ بوندی کے ایک درویش نے سلام کہا ہے، اور پھر وہ پیام کہا تو شیخ منغص ہوئے اور فرمایا

او درویشے عزیز است ولیکن زبان خود بر خود ندارد (ص ۱۴۶)

فوائد الفواد کے مرتب کی زبانی یہ روایت ہے

"میں نے اپنے ۔۔۔۔ ایک دوست سے ایک بات سنی ہے جو دل میں لگ گئی ہے، وہ بات یہ ہے کہ اس نے کہا کہ حج کیلئے وہی جاتا ہے جس کا کوئی پیر نہ ہو، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر

نے جب یہ بات سنی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور یہ مصرع زبان مبارک پر آیا

آں وہ بسوئے کعبہ برود ایں بسوئے دوست

اس کے بعد فرمایا کہ شیخ الاسلام فریدالدین قدس سرہ العزیز کی وفات کے بعد مجھ پر حج کا شوق غالب ہوا، میں نے کہا ذرا اجودھن جاکر شیخ کی زیارت کروں، جب شیخ الاسلام کی زیارت کو پہنچا تو میرا مقصد حاصل ہو گیا، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہی حاصل ہوا، دوسری بار پھر ہوس ہوئی، پھر شیخ کی زیارت کو گیا، پھر غرض حاصل ہو گئی"۔ (ص ۱۵۵)

اسرار الاولیا، مرتبہ بدر اسحٰق کے مطبوعہ نسخہ میں بھی سنین و اسماء کی لکھائی چھپائی کی اسی طرح کی غلطیاں ہیں جو اور مجموعوں میں ہیں، لیکن اس کے باوجود اس میں چشتیہ سلسلہ کی جو تعلیمات پیش کی گئی ہیں وہ وہی ہیں جو فوائد الفواد اور خیر المجالس میں ہیں، اس میں کہیں کفر و شرک کی بو نہیں آتی، جس کی بنا پر یہ رسالہ بالکل ہی نظر انداز کر دیے جانے کے لائق سمجھا جائے۔

اس مجموعہ پر جزوی اعتراضات کے ساتھ ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کی سیاحت کا ذکر ہے، جب کہ فوائد الفواد میں ان کی سیاحت کا کوئی ذکر نہیں، لیکن فوائد الفواد میں سیاحت کا ذکر نہ آنا اس سے قطعی انکار کی دلیل نہیں، ممکن ہے کہ فوائد الفواد میں اس لیے ذکر نہ کیا گیا کہ راحت القلوب اور سیر الاولیا، میں اس کا ذکر بار بار آچکا ہے، حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کے سفر نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اس زمانے میں منگولوں کے حملوں کے سبب راستے محفوظ نہ تھے، لیکن رہروان سلوک کے سفر کے لیے یہ سبب مانع نہیں ہو سکتا تھا، خود حضرت فریدالدین گنج شکرؒ نے اپنے مرید شیخ عارف کو سیوستان بھیجا اور حج کے لیے روانہ کیا (سیر الاولیا، ص ۱۸۴-۱۸۵) اسی زمانے میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی نے سفر کیا، اور شہاب الدین سہروردیؒ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے،

حضرت جلال الدین تبریزیؒ تو اسی زمانہ میں برابر متحرک رہے، ان کے پاؤں میں ہمیشہ چکر رہا، اس طرح حضرت فریدالدین گنج شکرؒ نے بھی حضرت خواجہ عثمان ہارونی، حضرت خواجہ معین الدینؒ اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی روایت کے مطابق، روحانی تعلیمات کی غرض سے مختلف مقامات پر جاکر بزرگان دین سے کسب فیض کیا تو اس سے انکار کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں، پھر پروفیسر خلیق احمد نظامی کو اپنی عالمانہ کتاب دی لائف اینڈ ٹائمس آف شیخ فریدالدین گنج شکرؒ میں اس کو تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہوا ہے کہ انھوں نے قندھار اور سیستان کا سفر کیا، گو وہ بھی حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے اور دوسرے مقامات کی سیاحت کے قائل نہیں ہیں، لیکن وہ اس پر آشوب زمانہ میں ہندستان سے نکل کر قندھار اور سیستان جا سکتے تھے، تو پھر ان کا غزنی، بخارا، بغداد اور بدخشاں پہنچنا ناممکن نہیں کہا جا سکتا ہے، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی رحلت ۶۳۲ھ میں ہوئی جب کہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی عمر ۵۷۱ھ کے سنہ پیدائش کے لحاظ سے ۶۲ برس کی تھی، اور اپنے مرشد کی رحلت کے بعد اجودھن میں رشد و ہدایت کی مسند پر مستقل طور سے متمکن ہوئے، اس سے پہلے اپنی عمر کی اس طویل مدت میں اگر وہ مختلف مقامات کی سیاحت کے لیے باہر گئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں خصوصاً جب چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے یہاں مختلف مقامات پر پہنچ کر بزرگان دین سے کسب فیض کرنے کی بڑی اہمیت تھی،

پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنی کتاب دی لائف اینڈ ٹائمس آف شیخ فریدین گنج شکر میں لکھتے ہیں:

"عہد وسطیٰ میں راہ سلوک کی تعلیم و تربیت میں سیاحت لازمی جزء تھا، اس کے متعدد فوائد تھے، ...... مولانا عزیز الدین محمود بن علی کاشانی نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ ان سیاحتوں سے کیا کیا فوائد حاصل ہوتے تھے، اکابر خواجگان چشت میں شیخ عثمان ہردانی، شیخ معین الدین چشتی اور شیخ قطب الدین برسوں دور دور تک سفر کرتے رہے"۔ (ص ۲۷)

البتہ یہ غور کرنا ہے کہ اسرار الاولیا، اور اس کے ساتھ راحت القلوب میں اس سیاحت کے دوران میں حضرت فریدالدین گنج شکرؒ نے جن جن بزرگوں کی زیارت کی، وہ ممکن بھی کہ نہیں، وہ بغداد میں حضرت شہاب الدین سہروردیؒ (المتوفی ۶۳۲ھ)، بخارا میں شیخ سیف الدین باخرزی (المتوفی [illegible]) میں ملے، بغداد میں ان کی ملاقات خواجہ اجل سنجری اور سیوستان میں شیخ اوحد الدین کرمانی سے بھی ہوئی۔ ان دونوں بزرگوں کا سنہ وفات تو نہیں معلوم لیکن وہ دونوں حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے معاصر تھے، اس لحاظ سے حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کا ان تمام بزرگوں سے ملنا بعید از قیاس نہیں، البتہ راحت القلوب میں دو جگہوں پر عبارت کھٹکتی ہے، ایک تو حسب ذیل ہے:

"وقتے جانب بدخشاں مسافر بودم، در آں شہر بزرگان اولیا بودند، چنانچہ عبدالواحد نبیسہ شیخ ذوالنون مصری قدس اللہ سرہ العزیز بیرون شہر میان غاری سکن داشت چوں شنیدم نزدیک آں غار شدم۔" (ص ۱۷)

نبیسہ کے معنی پوتے لیے جائیں تو ذوالنون مصری (المتوفی ۲۴۶ھ) کے پوتے سے حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی ملاقات ممکن نہیں ہو سکتی، لیکن نبیسہ سے پوتوں کی اولاد بھی مراد لی جائے تو پھر شیخ عبدالواحد کو حضرت ذوالنون مصری کے پوتے کی اولاد سمجھنا چاہیے، جس سے پھر حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کی ملاقات کے سلسلہ میں شبہ پیدا نہیں ہوتا، اسی طرح راحت القلوب کی یہ ایک جگہ ہے:-

"وقتے در خدمت شیخ یوسف چشتی قدس سرہٗ حاضر بودم۔" (ص ۲۲)

معلوم نہیں شیخ یوسف چشتی سے کون مراد ہیں، اگر یہ خواجہ ابو یوسف ناصر الدین چشتی ہیں، تو ان سے ملنا ممکن نہیں، کیونکہ یہ حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے دادا پیر کے پیر ہیں، اگر [illegible] طور پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی اور بزرگ تھے، جو خواجہ ابو یوسف ناصر الدین چشتی سے مختلف تھے۔

اگر اس کو میری بے جا تاویل سمجھی جائے اور مذکورہ بالا فروگذاشت کو ناقابل معافی غلطی قرار دے کر راحۃ القلوب کو جعلی سمجھنے پر اصرار کیا جائے تو پھر ایک عیب جو ناقد حمید قلندر کی حسب ذیل روایت کو پڑھ کر خیر المجالس کے متعلق وہی رائے قائم کر سکتا ہے، جو راحۃ القلوب کے بارے میں ہو سکتی ہے۔

"اس کے بعد یہ حکایت بیان فرمائی کہ خواجہ عثمان ہروانیؒ کا ایک مجذوب درویش کا ساتھ تھا، جن کا نام فرزند خیر[1] تھا، وہ درویش ایک شہر میں گئے تو وہاں کی جامع مسجد میں قیام کیا اور محراب کے سامنے سو گئے، مسجد لکڑی کی بنی ہوئی تھی، اس کی دیوار اور چھت بھی لکڑی کی تھی، نماز کے وقت موذن آیا اور ..... پائے مبارک کو کھینچا، وہ درویش اٹھ گئے۔ انھوں نے ایک آہ کی تو ان کے منہ سے آگ پیدا ہوئی، مسجد میں آگ لگ گئی، درویش باہر نکل آئے، آگ شہر تک پہنچ گئی، شہر جلنے لگا، شیخ عبداللہ انصاری شہر میں تھے، ان کو خبر کی گئی کہ ایک بزرگ جامع مسجد میں سوئے ہوئے تھے، موذن نے ان سے گستاخی کی، ان کا پاؤں کھینچا، انھوں نے آہ کی۔ تو ان کے منہ سے آگ نکلی، اس وقت وہ آگ شہر میں آگئی ہے اور جلا رہی ہے، شیخ عبداللہ انصاری نے کہا کہ وہ بزرگ کس طرف گئے، لوگوں نے بتایا کہ فلاں طرف گئے، پیچھا کیا، تو ان کے پاس جا پہنچے، فرمایا اے درویش! یہ شہر مجھکو بخش دو، کہا نہیں بخشتا ہوں، پھر فرمایا بخش دو، کہا ایک ثلث دیا، فرمایا کچھ اور زیادہ دیدو، کہا دو ثلث دیا، شیخ عبداللہ انصاری واپس آئے، ایک ثلث شہر جل چکا تھا، دو ثلث باقی رہ گیا تھا۔" (ص ۵۳)

اس روایت سے ظاہر ہے کہ حضرت عثمان ہروانیؒ، مجذوب بزرگ اور شیخ عبداللہ انصاری کا زمانہ ایک تھا، حالانکہ یہ صحیح نہیں، شیخ عبداللہ انصاری کی وفات پانچویں صدی میں ۴۸۱ھ

[1] علی گڈھ کے مطبوعہ نسخہ میں فرزند خیر نام لکھا ہوا ہے، اسی کے حاشیہ میں ایک دوسرے نسخہ کے حوالے سے یہ لکھا گیا ہے کہ "نام او یاد نماند"۔ خیر المجالس کے اردو ترجمہ سیر المجالس میں نام "چرک" تحریر ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ بعض اوقات نام لکھنے میں کتنا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

میں ہوئی، حضرت خواجہ عثمان کی ولادت چھٹی صدی ہجری اور وفات ساتویں صدی ہجری میں ہوئی، دونوں کی معاصرت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ شیخ عبداللہ انصاری ہرات والے بزرگ نہ تھے، جن کی وفات ۴۸۱ھ میں ہوئی، بلکہ کوئی دوسرے بزرگ تھے، جن کے نام کی غلط کتابت ہوگئی ہے، یہ کہتے وقت، راحۃ القلوب کے تسامح کو بھی سامنے رکھنا پڑے گا۔

اسرار الاولیاء کی مجلس دوم (ص ۱۱) میں ہے۔

"بعد ازاں فرمود کہ اے درویش وقتے برادرم مولانا بہاء الدین زکریا و دعا گوی یکجا نشستہ بودیم حکایت سلوک می رفت زمانے برآمد برادرم بہاء الدین برخاست ایستادہ شد بہ آہاے بگریست گفت انا للہ وانا الیہ راجعون، دعا گوی پرسید کہ ایں چہ حالت است گفت برخیز بیا چوں برخاستم و چہ بینم از دروازہ بغداد جنازہ شیخ سعد الدین حمویہ آوردہ اند و نماز جنازہ می گذارند پیش مسجد جامع بغداد۔" (ص ۱۱)

اس روایت میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ حضرت سعد الدین حمویہ (المتوفی ۶۵۰ھ) کی وفات حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی زندگی ہی میں ہوئی، فوائد الفواد میں ہے:

"بعد ازاں خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ اول شیخ سعد الدین حمویہ نقل کرد، بعد از و بسہ سال شیخ سیف الدین باخرزی بعد از و بسہ سال شیخ بہاء الدین زکریا بعد از و بسہ سال شیخ فرید الدین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔" (ص ۱۳)

لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ اس کی فصل اول ۶۳۱ھ میں شروع ہوئی، اور اس کے آخر میں بیان ہے کہ اس میں بارہ سال تک کے ملفوظات جمع کیے گئے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ اس میں ۶۴۳ھ تک کے واقعات ہیں، پھر حضرت سعد الدین حمویہ (المتوفی ۶۵۰ھ) کا ذکر کیسے آسکتا ہے، پہلے کہا گیا ہے کہ اس میں سنین اور اسماء کی غلطیاں ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ ۶۳۱ھ کے سنہ میں کتابت کی غلطی ہوگئی ہو، پھر آخر میں اجمالی طور پر یہ کہا گیا ہے کہ

"از اسرار و انوار و الفاظ در بار شیخ الاسلام در مدت دوازدہ سال شنیدہ است درین مجموعہ نبشتہ آمد۔"

اس کو ۶۳۱ھ کے بعد ہی کے بارہ سال سمجھنا محض خردہ گیری ہے، اسرار الاولیاء کی پہلی فصل میں تو تاریخ دی ہوئی ہے لیکن ۲۲ فصلوں میں سے کسی ایک میں بھی تاریخ نہیں درج ہے، اس لیے پہلی فصل کی تاریخ کو غلط سمجھ کر کتاب سے نکال دیا جائے تو پھر ترتیب زمانی میں کوئی التباس پیدا نہیں ہوتا، اس طرح اس میں جو واقعات درج ہیں، اس لحاظ سے یقین کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا کہ حضرت سعد الدین حمویہ (المتوفی ۶۵۰ھ)، شیر خاں (المتوفی ۶۶۲ھ) اور حضرت نجیب الدین متوکل کی وفات سے پہلے یہ ملفوظات مرتب ہوئے، پھر پروفیسر صاحب موصوف کا یہ اعتراض صحیح نہیں ہوگا کہ ان بزرگوں کی زندگی کا جو زمانہ ہے اسی میں ان کی وفات کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

اسرار الاولیاء (ص ۹۰) میں ہے:-

"فرمود کہ اے درویش وقتے من و شیخ جلال تبریزی قدس اللہ سرہ العزیز در بداؤن رسیدیم روزے در دہلیز خانہ نشستہ بودیم۔"

اس پر پروفیسر صاحب کا اعتراض ہے کہ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کبھی بداؤں تشریف نہیں لے گئے، لیکن جن مستند ماخذوں کی بنا پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے، ان کے نام نہیں لکھے گئے ہیں، قطعی طور پر یہ کہنا صحیح نہیں کہ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کبھی بداؤں تشریف نہیں لے گئے، کیونکہ سیر الاولیاء میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی زبانی یہ روایت ہے کہ شیخ نجیب الدین متوکل کے ایک بھائی بداؤں میں تھے، اور وہ ہر سال ان سے ملنے کے لیے جاتے تھے،

"سلطان المشائخ می فرمود کہ شیخ نجیب الدین متوکل را برادرے بود در بداؤں، ہر سال بدیدن او آنجا رفتے تا وقتے ہر دو برادر بدیدن شیخ علی بزرگ کہ صاحب نعمت بود در بداؤں رفتند۔" (ص ۱۶۷)

شیخ نجیب الدین متوکل حضرت فریدالدین گنج شکر کے بھائی تھے، اسلیے بہت ممکن ہو کہ وہ بھی اپنے بھائی سے ملنے بداؤں گئے ہوں، ایسی حالت میں حضرت جلال الدین تبریزی کے ساتھ بداؤں میں ہونا کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہو سکتی، خصوصاً فوائد الفواد، خیر المجالس اور سیر الاولیاء کی روایتوں سے ظاہر ہے کہ حضرت جلال الدین تبریزی کئی بار بداؤں پہنچے۔

اسی کے ساتھ اسرار الاولیاء کی مذکورہ بالا روایت کو ہمدردانہ طور سے پڑھنے کے بعد یہ بھی خیال ہوتا ہو کہ ممکن ہے اس میں من او جمع متکلم کا صیغہ غلط کتابت کی وجہ سے اضافہ ہوگیا ہو، کیونکہ اسی روایت میں پھر یہ صیغہ نہیں آیا ہو، اس لیے اگر اسرار الاولیاء کا کوئی قدیم ترین نسخہ دیکھا جائے تو ممکن ہو کہ اس میں مذکورہ بالا الفاظ کے بجائے حسب ذیل الفاظ ہوں،

"فرمود کہ اے درویش وقتے شیخ جلال تبریزی قدس اللہ سرہ العزیز در بداؤں رسید، روزے در دہلیز خانہ نشستہ بود"

اس طرح یہ روایت فوائد الفواد (ص ۱۳۲) کی روایت کے بالکل مطابق ہو جاتی ہو، اور اسکے بعد یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت خواجہ نے اپنے مرشد ہی کی زبانی یہ روایت دہرائی جو فوائد الفواد میں قلمبند کردی گئی، خیر المجالس کی مجلس پنجاہ و ششم میں یہ روایت کچھ بڑھا کر درج کی گئی ہے، لیکن اس جزوی اختلاف سے نفس حکایت اور پوری کتاب پر کوئی حرف نہیں آتا، اسی روایت کے سلسلہ میں پروفیسر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی ملاقات حضرت فریدالدین گنج شکرؒ سے بداؤں میں کبھی نہیں ہوئی، اس کے لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی، کیونکہ خود پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے جانے کے بعد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی ولادت ہوئی، ظاہر ہے کہ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے ساتھ اگر آئے بھی ہوں گے تو اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے ملنے کا سوال ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

(باقی)

حافظ ابن کثیرؒ

از مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

علمائے اسلام میں حافظ ابن کثیر کا پایہ بہت بلند ہے، وہ ایک مشہور مصنف، جلیل القدر مفسر، مستند مورخ اور صاحب کمال محدث ہیں، ان کو فقہ، فتوی، درس و تدریس اور مناظرہ وغیرہ سے بھی اشتغال رہا ہے، اور ان کی بعض تصنیفات مثلاً تفسیر قرآن اور تاریخ البدایہ والنہایہ اپنے استناد و اعتبار کے لیے مشہور ہیں، مگر افسوس کہ تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں، اور اردو میں تو ان کے متعلق کچھ لکھا ہی نہیں گیا، اردو دانوں کیلیے ان کی عظمت و شخصیت کے اکثر گوشے تاریکی میں ہیں، اس لیے اس مضمون میں ان کا تذکرہ اور مشہور تصنیفات پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

نام و نسب اسمٰعیل نام ابو الفدا کنیت اور عماد الدین لقب تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے: اسمٰعیل بن عمر ابن کثیر بن ضوء بن ذرع[۱]۔

بعض دوسرے علمائے اسلام کی طرح ان کو بھی دادا کے نام پر شہرت ہوئی اور وہ ابن کثیر کے نام سے مشہور ہوئے۔

ولادت اکثر مورخین اور اصحاب سیر کے بیان کے مطابق وہ ۷۰۱ھ میں اور بعض کے بیان کے مطابق ۷۰۰ھ میں پیدا ہوئے، علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:

ولد سنة سبعمائة وبعدها بيسير[۲] وہ ۷۰۰ھ میں یا اس کے کچھ بعد پیدا ہوئے۔

۱؎ ذیل طبقات ذہبی للحسینی ص ۵۷، و ذیل للسیوطی ص ۳۶۱ و الدرر الکامنہ ج ۱ ص ۳۷۳ و شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۳۱

۲؎ الدرر الکامنہ ج ۱ ص ۳۷۴

وطن حافظ ابن کثیر شام کے شہر بصریٰ کے ایک نواحی گاؤں مجدل میں جہاں ان کا ننھیال تھا، اور ان کے والد خطیب بھی تھے، پیدا ہوئے، لیکن صغر سنی ہی میں والد کے ہمراہ دمشق چلے آئے اور عمر کا زیادہ حصہ یہیں بسر ہوا، اس لیے بصری اور دمشقی دونوں نسبتوں سے مشہور ہوئے۔

اساتذہ اور شیوخ علامہ ابن کثیر کو اپنے زمانہ کے مشہور علماء و فضلاء سے استفادہ کا موقع ملا، ان کے بعض اساتذہ کے نام یہ ہیں: برہان الدین ابو اسحٰق ابراہیم بن تاج الدین ابو محمد عبدالرحمٰن متوفی ۷۲۹ھ، ابو المعالی کمال الدین محمد بن علی بن عبدالواحد بن محمد الاسلم زملکانی متوفی ۷۲۷ھ سے فقہ کی، اور عفیف الدین اسحٰق بن یحییٰ آمدی متوفی ۷۲۵ھ، رئیس الاطباء محمد بن ابراہیم سویدی متوفی ۷۱۱ھ، بہاء الدین قاسم بن عساکر متوفی ۷۲۳ھ، ابو العباس احمد حجار بن شحنہ متوفی ۷۳۰ھ، ابو الحجاج یوسف بن عبدالرحمٰن مزی متوفی ۷۴۲ھ، ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بن ابراہیم رضی طبری متوفی ۷۲۲ھ اور ابن زراد سے حدیث کی تعلیم پائی اور محمد بن ابراہیم بن محمد بن احمد دمشقی وانی متوفی ۷۳۵ھ اور بدر الدین یوسف بن عمر بن حسین ختنی متوفی ۷۳۱ھ اور یحییٰ بن ابراہیم دبوسی متوفی ۷۲۹ھ سے اجازت اور نجم الدین عبداللہ بن محمد بن محمد اصبہانی سے اصول کی تعلیم حاصل کی،

ان کے علاوہ بعض اور [illegible] بھی ہیں، جن کا انھوں نے البدایہ والنہایہ میں ذکر کیا ہے، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ سے بھی ان کو شرف تلمذ حاصل تھا، اور حافظ مزی سے خصوصی تعلق تھا، اس لیے ان دونوں کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے،

مزی ابو الحجاج جمال الدین یوسف بن عبدالرحمٰن بن یوسف ربیع الآخر ۶۵۴ھ میں حلب میں پیدا ہوئے اور مزۃ میں نشو و نما پائی، عربی زبان و ادب اور صرف و نحو میں بڑا درک تھا، فقہ سے بھی ان کو خاص مناسبت تھی، اور حدیث پر گہری اور استادانہ نظر تھی، اسی لیے الحافظ الکبیر کہے جاتے تھے، معاصر علماء کو ان کے فضائل و کمالات کا اعتراف تھا، ابن قاضی شہبہ، شیخ المحدثین، عمدۃ الحفاظ

مجو بۃ الزمان وغیرہ کے القاب سے ان کو یاد کرتے ہیں،

بیس سال کی عمر میں گھر بار چھوڑ کر علم حدیث کی تحصیل کے لیے نکل پڑے اور اپنے دور کے ممتاز علماء اور نامور محدثین سے سماع کیا، ان کے شیوخ کی تعداد ہزار کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے؛ تحصیل حدیث کے بعد اس کے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور نصف صدی تک اس کا سلسلہ جاری رہا، جس سے ہزاروں بندگان خدا فیضیاب ہوئے، دار الحدیث اشرفیہ کے ساڑھے تیئیس ۲۳ سال تک مہتمم رہے، علامہ ابن تیمیہ فرماتے تھے کہ اس مسند کا ان سے زیادہ کوئی اہل نہ تھا، دونوں بزرگوں میں دوستانہ تعلقات اور مخلصانہ روابط تھے، علامہ ابن کثیر کا ان سے رشتہ بھی ہوتا تھا، اور وہ حافظ مزی کے داماد تھے، اس بنا پر ان کو ان کے ساتھ رہنے کا زیادہ اتفاق ہوا، اور ان سے استفادہ کا زیادہ موقع ملا،

مزی کی تصنیفات میں تہذیب الکمال کو جو اسماء الرجال کی نہایت مستند کتاب ہے، بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، علامہ ذہبی کی تذہیب التہذیب اور حافظ ابن حجر کی تہذیب التہذیب اسی کی تلخیص ہے، لیکن حافظ ابن حجر نے اپنی تصنیف میں بہت اضافہ بھی کیا ہے۔

صفر ۷۴۲ھ میں انتقال کیا اور مقابر صوفیہ میں علامہ ابن تیمیہ کی قبر کے غرب میں دفن کیے گئے،

علامہ ابن تیمیہ اور ابن کثیر علامہ ابن تیمیہ کی شہرت کسی تعارف کی محتاج نہیں، حافظ ابن کثیر کو ان کی صحبت میں رہنے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا، ان کے بعض تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق دوسرے اساتذہ کے مقابلہ میں انھوں نے ان سے زیادہ تر استفادہ کیا، اس لیے ان سے بڑا تعلق خاطر رکھتے تھے، اور شافعی ہونے کے باوجود شیخ الاسلام کے بڑے گرویدہ اور ان کی عظمت و امامت کے قائل تھے،

طلاق اور بعض دوسرے اجتہادی مسائل جن میں ابن تیمیہ جمہور اور تمام علماء کے خلاف رائے رکھتے

تھے، ان میں بھی ابن کثیر اپنے استاد کے ہمنوا اور ان کے خیالات کی تائید اور مدافعت کرتے تھے، اس تائید و حمایت اور ابن تیمیہ سے غایت تعلق کی بنا پر ان کو بھی تکلیفیں اٹھانی پڑیں، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

اخذ عن ابن تیمیۃ ففتن بحبه وامتحن لسببه (الدرر ج ۱ ص ۳۷۴)

امام ابن تیمیہ سے استفادہ کیا اور انکی محبت کی وجہ سے مبتلائے مصیبت کیے گئے۔

ابن عماد کا بیان ہے:

کانت له خصوصیة بابن تیمیة ومناضلة عنه واتباع له فی کثیر من آرائه وکان یفتی برأیه فی مسئلة الطلاق وامتحن بسبب ذالك و اوذی (شذرات الذهب ج ۶ ص ۲۳۲)

ان کو ابن تیمیہ سے خاص تعلق اور شرف تلمذ حاصل تھا اور وہ ان کی جانب سے حمایت و مدافعت کرتے تھے، اور اکثر مسائل میں ان کی پیروی کرتے تھے، مسئلۂ طلاق میں ان کا بھی وہی فتویٰ تھا جو ابن تیمیہ کا تھا، اسکی وجہ سے ان کو آزمائشوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اس تعلق کی بنا پر ابن کثیر نے اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں امام ابن تیمیہ کے حالات تفصیل اور بڑے والہانہ انداز میں لکھے ہیں اور ان سے اپنی عقیدت و تعلق کا اکثر اظہار کیا ہے، اور انکی طرف سے مدافعت بھی کی ہے، ایک جگہ اپنے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وکان بینی وبینه مودة وصحبة من الصغر وسماع الحدیث والطلب (البدایة والنهایة ج ۱۴ ص ۱۳۰)

میرے اور ان کے درمیان محبت آمیز تعلقات تھے، اور مجھکو بچپن سے ان کے ساتھ رہنے، علم حاصل کرنے اور حدیثیں سننے کا موقعہ ملا۔

امام ابن تیمیہ کے انتقال کے بعد اپنے خسر کے ہمراہ قید خانے میں جاکر ان کے چہرہ کا بوسہ لیا (ایضاً ۱۳۸)

والد کی وفات اور ان کا مختصر تذکرہ جمادی الاولی ۷۰۳ھ میں جب ابن کثیر بہت کم عمر تھے ان کے والد کا قریہ مجدل میں انتقال ہوگیا، وہ ۶۴۰ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور ان کو علم و فن سے بڑا اشتغال رہا۔

عربی شاعری سے خاص ذوق تھا، دواوین عرب ان کو ازبر تھے، وہ خود بھی شعر کہتے تھے، شروع میں بصریٰ کے بعض مدرسوں میں مدرس رہے، اس کے بعد وہیں خطابت کے منصب پر فائز ہوئے، پھر مجدل میں جو انکی ایک بیوی اور ابن کثیر کی والدہ کا وطن تھا خطیب مقرر ہوئے اور آرام و فراغت سے زندگی بسر کرنے لگے۔ وہ فصیح اللسان و شیریں بیان خطیب تھے، ان کی تقریر بڑی موثر ہوتی تھی، لوگ ان کو بڑی وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، امام نووی اور تقی الدین فزاری سے جو ان کا بڑا احترام کرتے تھے، نحو اور دوسرے علوم حاصل کیے،

علامہ ابن کثیر کے والد نے دو شادیاں کیں، پہلی بیوی سے تین لڑکے اسمٰعیل، یونس اور ادریس پیدا ہوئے، دوسری بیوی سے جو ابن کثیر کی ماں تھیں، عبد الوہاب، عبد العزیز، محمد اور چند لڑکیاں اور سب سے آخر میں اسمٰعیل بن کثیر پیدا ہوئے،

اسماعیل ان کے بڑے لڑکے کا بھی نام تھا اور سب سے چھوٹے کا بھی۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ بڑے صاحبزادے چھت سے گر کر انتقال کر گئے تو ان کو بڑا غم ہوا، اس لیے جب علامہ ابن کثیر پیدا ہوئے تو ان کی یاد میں ان کا نام اسماعیل رکھا،

علامہ ابن کثیر اپنے والد کے انتقال کے بعد ۷۰۷ھ میں مجدل سے دمشق گئے اور کمال الدین عبد الوہاب کے سایۂ عاطفت میں رہے، ان کا بیان ہے کہ "وہ ہمارے بڑے کرمفرما اور مہربان تھے، ۷۵۰ھ تک زندہ رہے، ان کی بدولت مجھکو علم سے تعلق اور اس کا ذوق پیدا ہوا اور تمام دشواریاں اور موانع ختم ہوگئے اور بڑی سہولت میسر آئی،[1]

اولاد ابن کثیر کی اولاد میں صرف ابو البقا، بدر الدین محمد (متوفی ۸۰۳ھ) کے نام کا ذکر البدایہ والنہایہ اور حسینی کے ذیل طبقات میں ملتا ہے۔

---

[1] البدایة والنهایة ج ۱۴ ص ۳۱ و ۳۲

تلامذہ تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں ان سے استفادہ کرنے والوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا، صاحب شذرات نے ان کے ایک شاگرد ابن حجی کا اور صاحب جلاء العینین نے علامہ ابن حجر کو ان کا شاگرد بتایا ہے، لیکن ابن کثیر جیسے فاضل اور یکتائے زمانہ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ رہی ہوگی، اسی لیے صاحب جلاء العینین لکھتے ہیں:۔

وتلامذته كثيرة منهم العلامة	ان کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے،
ابن حجر العسقلانی (جلاء العینین ص ۲۲)	اور ان میں ایک علامہ ابن حجر عسقلانی بھی تھے۔

مگر افسوس باوجود کوشش ان کے نام تک نہ معلوم ہو سکے۔

سیر و سیاحت حافظ ابن کثیر نے طلب علم کے لیے سفر و سیاحت بھی کی تھی، گو تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں اس کی تفصیل نہیں ملتی، صاحب اعلام نے صرف اس قدر اشارہ کیا ہے:

ورحل (اعلام ج ۱ ص ۱۱۹)	اور انھوں نے (طلب علم کے لیے) سفر کیے۔

فضل و کمال علامہ ابن کثیر آٹھویں صدی ہجری کے نامور عالم اور مشہور مصنف ہیں، قدرت نے ان کی ذات میں فضل و کمال اور جامعیت کے تمام اوصاف و خصوصیات جمع کر دیے تھے، ان کے زمانہ میں جو علوم رائج تھے ان سب میں ان کو دستگاہ حاصل تھی، اور بعض علوم میں تو وہ یگانہ تھے، ذیل میں ان کے فضل و کمال کے مختلف پہلوؤں کا ذیلی عنوانات کے تحت تذکرہ کیا جاتا ہے۔

حافظہ حافظ ابن کثیر کا حافظہ نہایت عمدہ تھا، تمام مورخین اور اصحاب کمال نے ان کی اس خصوصیت کا ذکر اور اعتراف کیا ہے، صاحب شذرات اور صاحب جلاء العینین بحوالہ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں:

وكان كثير الاستحضار، قليل النسيان جداً[1]	ان کا علم نہایت مستحضر تھا اور وہ بہت کم بھولتے تھے۔

لہ شذرات ج ۶ ص ۲۳۱ و جلاء العینین ص ۲۲ و الدرر الکامنہ ج ۱ ص ۳۷۴

اول دونوں اصحاب سیر نے لکھا ہے:

ووصفه بحفظ المتون وكثرة الاستحضار جماعة منهم الذهبي والحسيني والعراقي وغيرهم[1]	ان کے عمدہ حافظہ، متون کی یادداشت اور کثرت استحضار کا اکثر لوگوں نے ذکر کیا ہے، جیسے ذہبی، حسینی اور عراقی وغیرہ نے۔

آگے چل کر ابن عماد ابن حجر کے حوالہ سے تحریر کرتے ہیں:

احفظ من ادركناه لمتون الاحاديث[2]	میرے جاننے اور ملنے والوں میں وہ حدیثوں کے متن کے سب سے بڑے حافظ تھے۔

مورخین کا بیان ہے کہ وہ اپنے حفظ و ضبط کے لیے مشہور تھے، ان کے حافظہ کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ التنبیہ جس کو انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں مرتب کیا تھا، اور مختصر ابن حاجب ان کو از بر تھی[3]۔

جودت طبع بڑے ذہین و طباع تھے، مذاق بہت بلند پایا تھا، فہم و فراست اور عقل و دانش سے بہرہ ور تھے، ابن عماد وغیرہ نے اس خصوصیت کو جید الفہم کے جامع الفاظ میں ظاہر کیا ہے[4]۔

تاریخ، فقہ، تفسیر اور حدیث میں امتیاز علامہ ابن کثیر کو متعدد علوم و فنون میں خاص دستگاہ تھی، لیکن تاریخ، فقہ اور تفسیر و حدیث کے وہ امام تھے، اور ان علوم میں ان کے زمانہ میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا، مورخین اور اصحاب سیر کا متفقہ بیان ہے:

وانتهت اليه رياسة العلم في التاريخ والحديث والتفسير[5]	تاریخ، حدیث اور تفسیر وغیرہ علوم کی ریاست کا ان پر خاتمہ تھا۔

حافظ ابن حجر علامہ ذہبی کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:۔

لہ شذرات و جلاء، ۲ہ شذرات ج ۶ ص ۲۳۱ ۳ہ ایضاً ۴ہ ایضاً ۵ہ جلاء العینین ص ۲۲ و شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۳۱

المحدث البارع فقیہ متفنن	(ابن کثیر) باکمال و مستند محدث، بے نظیر متفنن
محدث متقن مفسر نقاد[1]	فقیہ اور صاحب بصیرت مفسر تھے۔

صاحب البدر الطالع لکھتے ہیں :۔

برع فی الفقہ والتفسیر والنحو[2]	وہ فقہ، تفسیر اور نحو میں ماہر تھے،

الحافظ الکبیر اور الامام المحدث ان کے خاص القاب ہیں۔

ان علوم میں ان کا جو مقام تھا اور ان میں ان کو جس قدر عبور حاصل تھا، اس پر ان کی تصنیفات شاہد ہیں،

حدیث کے متعلقہ علوم سے بھی ان کو پوری واقفیت تھی، چنانچہ جرح و تعدیل اور علم رجال کے بھی بڑے ماہر مانے جاتے تھے، صاحب البدر الطالع لکھتے ہیں :۔

امعن النظر فی الرجال والعلل[3]	رجال اور علل پر ان کی اچھی نگاہ تھی۔

ابن عماد کا بیان ہے کہ :۔

واعرفهم بجرحها ورجالها	جرح و تعدیل، رجال اور حدیثوں کی
وصحیحها وسقیمها وکان اقرانه	صحت و عدم صحت کے وہ بڑے واقف کار
وشیوخه یعترفون له بذالك[4]	تھے، ان کے معاصرین اور اساتذہ تک کو
	ان کے کمالات کا اعتراف تھا،

ابن حجر کی تنقید — علامہ ابن حجر نے کئی جگہوں میں ان کے علم حدیث اور اس کے متعلقہ علوم میں مہارت و جامعیت کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

واشتغل بالحدیث مطالعة فی متونه	حدیث کے متن و رجال کے مطالعہ سے
ورجاله[5]	ان کو اشتغال رہا۔

---

[1] الدرر ج ۱ ص ۳۷۴ و ذیل طبقات الحسینی ص ۵۸ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۱۵۳ [3] ایضاً [4] شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۳۲
[5] الدرر الکامنہ ج ۱ ص ۳۷۴

آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں :

وخرج احادیث ادلة التنبیه	ادلۃ التنبیہ اور مختصر ابن حاجب
واحادیث مختصر ابن الحاجب	اصلی کی حدیثوں پر جرح کیا

الاصلی (الدرر الکامنہ ج ۱ ص ۳۷۴)

علم حدیث، فن رجال اور جرح و تعدیل میں ابن کثیر کے اشتغال کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ "انھوں نے اپنی تفسیر اور کتاب الاحکام وغیرہ میں نہ صرف روایات جمع کی ہیں بلکہ ان پر نقد و تبصرہ بھی کیا ہے، بخاری کی شرح لکھی ہے اور تاریخ اور طبقات الشافعیہ میں رجال سے بحث کی ہے، ادلۃ التنبیہ اور مختصر ابن حاجب کی حدیثوں کی جانچ کی ہے، اور اس میں مفید باتوں کا اضافہ بھی کیا ہے، اصول حدیث میں ابن صلاح کے رسالہ کا اختصار کیا، اور مزی سے ان کی تہذیب الکمال حاصل کی۔

حافظ ابن حجر نے بھی ابن کثیر کے حالات میں ان تمام باتوں کا ذکر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے باکمال اور بلند پایہ محدث ہونے اور علم رجال و جرح و تعدیل میں ان کی مہارت کا بڑے بڑے ائمہ کو اعتراف ہے، مگر اس کے باوجود انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

ولم یکن علی طریق المحدثین فی	عوالی کی تحصیل اور اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز
تحصیل العوالی وتمییز العالی	میں وہ محدثین کے طریقہ پر نہ تھے، بلکہ وہ
من النازل ونحو ذلك من فنونهم	فقہاء محدثین میں ہیں،

وانما هو من محدثی الفقهاء (الدرر الکامنہ ج ۱ ص ۳۷۴)

اس سے شبہ ہوتا ہے کہ حافظ ابن کثیر بلند پایہ محدث نہ تھے، اور علم رجال و فن جرح و تعدیل میں زیادہ کمال نہ رکھتے تھے، جو صحیح نہیں ہے، علامہ ابن حجر نے ان کے کمالات کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ اس کی تردید کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے علامہ حسینی اور حافظ سیوطی وغیرہ نے علامہ ابن حجر کی اس

رائے پر نقد کیا ہے اور اس کو انصاف کے خلاف بتایا ہے۔

حسینی لکھتے ہیں:۔

وان کان الغالب علیه السعة	گو حفظ متون میں حافظ ابن کثیر کو زیادہ
فی حفظ المتون لکن لم یکن بحیث	دخل تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عالی
یمیز العالی من النازل باعتبار	وسافل روایتوں میں راویوں کے درجات
معرفته بطبقات الرواة واحوالهم	واحوال کی معرفت کی، ان کو پرکھ اور تمیز
بل ذالك مما یخفی علی من هو	بھی۔ یہ باتیں تو ان سے بہت کمتر لوگوں پر بھی
دونه بمراحل فی معرفة الرجال	مخفی نہیں ہیں، چہ جائیکہ ان جیسا
کیف وقد لازم المزی فی ذالك	باکمال جس نے ایک عرصۂ دراز تک مزی جیسے
مدة طویلة وعنی بجمع التکمیل	باکمال اور صاحب فن کی خدمت میں بسر
وفی تراجم من شهروا بالبراعة	کیا ہو اور تکمیل اور مشہور رواۃ کے حالات
تمدوکو ابن حجر سامحه الله	وتراجم میں کتابیں لکھی ہوں۔ حافظ ابن حجر
	کو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ اس سے تو
(حاشیہ ذیل طبقات حسینی ص ۵۸)	ان کے مخفی عناد کا پتہ چلتا ہے۔

حافظ سیوطی نے بھی حافظ کے مندرجہ بالا خیالات پر تنقید کی ہے۔[1] حقیقت یہ ہے کہ ابن حجر کبھی کبھی اس طرح کی متضاد باتیں لکھ جاتے ہیں، امام ابن ماجہ کے متعلق بھی انھوں نے اسی تضاد کا اظہار کیا ہے۔

نحو اور عربیت | حدیث، تفسیر، فقہ اور تاریخ کی طرح وہ نحو وعربیت کے بھی امام تھے، صاحب البدر الطالع لکھتے ہیں:

[1] ذیل سیوطی ص ۳۶۷

وبرع فی الفقه والتفسیر والنحو[1] — وہ فقہ، تفسیر اور نحو کے ماہر تھے۔

ابن عماد کا بیان ہے: وشارك فی العربیة[2]۔

دوسرے علماء اور مورخین کو بھی حافظ ابن کثیر کے اس کمال کا پورا اعتراف ہے۔

طرز تحریر | حافظ ابن کثیر کا اسلوب بیان نہایت دلکش اور طرز تحریر بڑا شگفتہ ہے، جس پر ان کی تصنیفات شاہد ہیں۔ حافظ ابن حجر اور دوسرے اصحاب سیر نے بھی ان کے اسلوب بیان کی خوبی اور دلآویزی کا ذکر کیا ہے۔

افتاء | علامہ ابن کثیر اپنے زمانہ کے مشہور مفتی تھے، حافظ ابن حجر نے علامہ ذہبی کے حوالہ سے ان کو الامام المفتی لکھا ہے، علامہ شوکانی اور ابن حبیب وغیرہ نے بھی ان کے خصوصیات بیان کرتے ہوئے ان کو صاحب افتاء بتایا ہے، ان کو افتاء سے اس درجہ اشتغال تھا کہ ان کی زندگی ہی میں ان کے فتووں کی تمام اطراف اور شہروں میں شہرت ہو گئی تھی، علامہ ابن حبیب فرماتے ہیں: فطارت اوراق فتاویه الی البلاد (جلاء الیقین ص ۲۲)

مناظرہ | مناظرہ سے بھی خاص ذوق تھا، ان کے تذکرہ نگار اس خصوصیت کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

درس وتدریس | وہ صاحب درس وتدریس بھی تھے، اور انھوں نے مدتوں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ ۷۴۸ھ میں مسجد امام صالح میں حدیث کے استاد مقرر ہوئے، مدرسہ اشرفیہ میں بھی مدرس رہے، علامہ ذہبی کے انتقال کے بعد مدرسہ تنکزیہ میں بھی درس وتدریس کے فرائض انجام دیے،[3]

شعر وسخن | ابن کثیر نے اگرچہ خالص علمی مذاق پایا تھا، لیکن شعر وادب سے بھی ان کو دلچسپی تھی اور وہ اس کا بہت بلند مذاق رکھتے تھے، اور اپنی گوناگوں علمی مشغولیتوں کے باوجود کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، صاحب شذرات کا بیان ہے: وینظم نظما وسطا[4]

[1] البدر الطالع ج ۱ ص ۱۵۳ [2] شذرات الذهب ج ۶ ص ۲۳۱ [3] تاریخ آداب اللغة العربیة ج ۳ ص ۹۳

[4] شذرات الذهب ج ۶ ص ۲۳۱

ان کے دو شعر اکثر سوانح نگاروں نے نقل کیے ہیں:۔

تمر بنا الایام تتری وانما — نساق الی الآجال والعین تنظر

فلا عائد ذاک الشباب الذی مضی — ولا زائل هذا المشیب المکدر[1]

(ترجمہ) زمانہ گذرتا چلا جاتا ہے اور ہم لوگ موت کی طرف ہانکے جاتے ہیں اور ہماری نگاہیں یہ تماشا دیکھتی رہتی ہیں۔ گذشتہ شباب نہ لوٹ سکتا ہے اور نہ یہ تلخ اور تکلیف دہ بڑھاپا ٹل سکتا ہے۔

غرض حافظ ابن کثیر کے کمالات نہایت وسیع اور گوناگوں تھے، اور ان کے تمام معاصر علماء مورخین اور اصحاب نظر نے اس کا اعتراف کیا ہے،

وکان اقرانه وشیوخه یعترفون له بذالک[2] — ان کے معاصرین اور اساتذہ تک ان کے فضل وکمال کے قائل تھے۔

موجودہ زمانہ کے شام کے نامور فاضل علامہ کرد علی شام کے آٹھویں صدی کے نوابغ فن میں ابن کثیر کا بھی شمار کرتے ہیں۔

عماد الدین بن کثیر المفسر المورخ الفقیه صاحب التآلیف ومنها تاریخه المطول[3] — (اس صدی کے مشہور و مایہ ناز لوگوں میں) عماد الدین بن کثیر مفسر، مورخ، فقیہ اور صاحب تصنیف تھے، ان میں سے ان کی مطول تاریخ بھی ہے۔

(خطط الشام ج ۴ ص ۵۱)

مذہب ومسلک وہ مسائل فقہ میں امام شافعیؒ کے مسلک کے پیرو تھے، اہل سیر ان کو الفقیہ الشافعی لکھتے ہیں، انھوں نے طبقات الشافعیہ کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی، لیکن امام ابن تیمیہ سے ذاتی تعلق کی بنا پر بعض مسائل میں ان کے اور حنابلہ کے مسلک پر بھی عمل کرتے تھے۔

[1] شذرات ج ۶ ص ۲۳۱ [2] ایضاً

وفات علامہ ابن کثیر نے تقریباً ۷۴، ۷۵ سال کی عمر پائی تھی، بڑھاپے میں ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی، ابن حجر تحریر فرماتے ہیں:۔

وکان قد اضر فی اواخر عمره[1] — آخر عمر میں ان کی بصارت زائل ہوگئی تھی۔

۷۷۴ھ میں انتقال کیا، اور اپنے شیخ علامہ ابن تیمیہ کی قبر کے پاس ہی مقبرہ صوفیہ میں دفن کیے گئے[2]۔

تصنیفات علامہ ابن کثیر کا زیادہ وقت درس وتدریس البحث ومناظرہ، افتاء اور وعظ وارشاد میں گذرا تاہم انھوں نے متعدد بلند پایہ کتابیں بھی لکھیں اور ان کا شمار نامور مصنفین میں ہے، خصوصاً البدایہ والنہایہ اور تفسیر قرآن تو ان کی ایسی کتابیں ہیں جن سے علماء کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتے۔

وہ ان خوش قسمت مصنفین میں ہیں جن کی زندگی ہی میں ان کی کتابوں کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوگئی تھی اور وفات کے بعد بھی ان کو بڑا اعتبار اور حسن قبول حاصل ہوا، اہل نظر علماء اور باکمال مورخین نے ان کے اس کمال کا شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے، ابن حبیب کا بیان ہے:۔

واشتهر بالضبط والتحریر[3] — ضبط وتحریر کے لیے وہ مشہور ہیں۔

علامہ شوکانی رقمطراز ہیں:۔

وله تصانیف مفیدة وقد انتفع الناس بمصنفاته[4] — ان کی تصنیفات نہایت مفید ہیں اور لوگوں کو ان سے بڑا نفع حاصل ہوا۔

حافظ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں:۔

سارت تصانیفه فی البلاد فی حیاته وانتفع بها الناس بعد وفاته[5] — ان کی تصانیف ان کی زندگی ہی میں مختلف ملکوں میں پھیل گئی تھیں اور لوگوں نے ان کی وفات کے بعد ان سے فائدہ اٹھایا۔

[1] الدرر الکامنہ ج ۱ ص ۳۷۴ [2] شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۳۲ [3] ایضاً ص ۲۳۱ [4] البدر الطالع ج ۱ ص ۱۵۱ [5] الدرر الکامنہ ج ۱ ص ۳۷۴

صاحب اعلام لکھتے ہیں :-

وتناقل الناس تصانیفه فی حیاته[۱] انکی تصانیف انکی زندگی ہی میں پھیل گئی تھیں۔

علامہ ابن کثیر کی تصنیفات کی تعداد زیادہ نہیں لیکن جو ہیں وہ نہایت مستند اور منتخب ہیں اور ان سے ان کے کثرت مطالعہ، علم و تبحر اور بالغ نظری کا اندازہ ہوتا ہے، ذیل میں ان کی تصنیفات کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ تفسیر القرآن
۲۔ البدایۃ النہایہ
} یہ دونوں ان کی نہایت مشہور اور شہرۂ آفاق تصنیفات ہیں، اسلیے ان کا مفصل ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

۳۔ جامع المسانید۔ اس کا پورا نام جامع المسانید والسنن لاقوم السنن ہے، اور مسند کبیر اور کتاب الہدیٰ والسنن فی احادیث المسانید والسنن[۲] وغیرہ بھی اسی کے نام ہیں، یہ حافظ ابن کثیر کی مشہور تصنیف ہے۔ اس میں حدیث کی کتابوں صحاح ستہ، مسند احمد، مسند ابی بکر بزار، مسند حافظ ابی یعلی اور طبرانی کی معجم کبیر کی حدیثیں جمع کی ہیں[۳] اور اس کو حروف و ابواب کے مطابق مرتب کیا تھا[۴]۔ صاحب کشف الظنون نے تصریح کی ہے کہ یہ اصول اسلام کے متعلق روایتوں اور حدیثوں کا ذخیرہ ہے[۵]، اس کا ایک نسخہ کتبخانہ خدیویہ مصر میں اور ایک کوبرلی میں موجود ہے، کتبخانہ خدیویہ مصر کی فہرست میں اس کا جو تعارف کرایا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضخیم کتاب آٹھ جزوں میں ہے، اور اس میں رواۃ حدیث کے حالات خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے والے صحابہ کے تراجم بھی درج ہیں[۶]، مگر افسوس ہے کہ ابھی تک اس مفید علمی کتاب کی طباعت نہ ہو سکی۔

---

۱ اعلام ج ۱ ص ۱۰۹، ۲ البدر الطالع ج ۱ ص ۱۵۳، ۳ ایضاً و طبقات حسینی ص ۵۸، ۴ فہرست کتبخانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۲۳ و ذیل طبقات سیوطی ص ۳۶۱ و حاشیہ ذیل طبقات حسینی ص ۵۸، ۵ کشف الظنون ج ۱ ص ۳۸۵، ۶ فہرست کتبخانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۲۳ و تاریخ ادب اللغۃ العربیہ ج ۳ ص ۱۹

بعض مصنفین نے مسند شیخین اور مسند احمد کو بھی ان کی مستقل تصنیفات بتایا ہے لیکن غالباً یہ اسی کے مختلف اجزاء ہیں اور مستقل کتابیں نہیں ہیں۔

۴۔ طبقات الشافعیہ۔ اس کتاب کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوسکا، قیاس ہے کہ اس میں شوافع کے حالات و سوانح ہوں گے، وہ خود بھی شافعی تھے، اس لیے یہ کتاب انھوں نے ذوق اور دلچسپی سے لکھی ہوگی۔

۵۔ تخریج ادلۃ التنبیہ۔ مشہور شافعی ابو اسحاق ابراہیم بن علی شیرازی (متوفی ۴۷۶ھ) نے فقہ میں تنبیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، علامہ نے اپنی اس کتاب میں اس کے دلائل کی تخریج کی ہے، مورخین اور اصحاب سیر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۸ سال کی عمر میں اس کتاب کو مرتب اور حفظ کر لیا تھا،

وحفظ التنبیه وعرضه سنة ثمان عشرة (شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۳۲)
تنبیہ کو یاد اور ۱۸ سال کی عمر میں مرتب کرکے پیش کیا۔

بعض مصنفین نے اس کا نام احادیث ادلۃ التنبیہ لکھا ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس میں تنبیہ کے دلائل کے ساتھ ساتھ اس کی حدیثوں کی بھی تخریج کی ہوگی، شرح التنبیہ بھی اسی کتاب کا نام ہے، ابن کثیر ابو اسحاق کے ترجمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

وقد ذکرت ترجمته مستقصاة مطولة فی اول شرح التنبیه[۱]
میں نے استقصاء اور تفصیل سے ان کے حالات شرح التنبیہ کے شروع میں لکھے ہیں۔

۶۔ تخریج احادیث مختصر ابن حاجب۔ مشہور مالکی عالم جمال الدین ابو عمر عثمان بن عمر المعروف بابن حاجب (متوفی ۶۴۶ھ) نے اصول فقہ میں ایک کتاب لکھی تھی جو مختصر ابن حاجب

---

۱ البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۲۵

کے نام سے مشہور ہے، علامہ ابن کثیر نے اس کتاب کو بھی حفظ اور اس کی حدیثوں کی تخریج کی ہے،
البدایہ والنہایہ میں لکھتے ہیں :۔

ومختصرہ فی اصول الفقہ استوعب فیہ عامۃ فوائد الاحکام لسیف الدین الآمدی وقد من اللہ تعالیٰ علیّ بحفظہ وجمعت کراریس فی الکلام علی ما اودعہ فیہ من الاحادیث النبویۃ وللہ الحمد (البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۱۷۶)	ابن حاجب نے اصول فقہ میں جو مختصر لکھی اس میں سیف الدین آمدی کی احکام کے جملہ فوائد شامل ہیں، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ یہ کتاب مجھکو یاد ہوگئی اور الحمد للہ کہ چند جزوں میں میں نے اس کی حدیثوں پر بحث و کلام بھی کیا ہے۔

۷۔ **التکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاہیل** } جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس کا موضوع علم رجال ہے اور پانچ جلدوں میں ہے، ان کے خسر اور استاد مزی نے تہذیب الکمال کے نام سے رجال میں جو مشہور کتاب لکھی تھی، علامہ ذہبی کی میزان الاعتدال اسی کی تلخیص اور اختصار ہے، ابن کثیر کی یہ کتاب ان دونوں کی خصوصیات کی جامع ہے، یعنی اس میں تہذیب کا اختصار بھی ہے اور ذہبی نے جو مفید اور ضروری باتیں اضافہ کی ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں۔

۸۔ **اختصار علوم الحدیث**۔ علم حدیث میں علامہ ابن صلاح کے مشہور رسالہ مقدمہ ابن صلاح کا اختصار اور اس کی تلخیص ہے اور اس میں ابن کثیر کے اضافے بھی ہیں، اس کا نام علوم الحدیث اور اختصار علوم الحدیث دونوں ہے۔ یہ رسالہ شائع ہو چکا ہے۔

۹۔ **سیرت صغیرہ**۔ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و سوانح میں کوئی مختصر رسالہ ہے۔ لیکن اس کے متعلق مزید تفصیلات نہ معلوم ہو سکیں۔

۱۰۔ **الاجتہاد فی طلب الجہاد**۔ یہ ۸۰ صفحے کا رسالہ ہے، جو امیر منجک کی فرمایش پر ساحلی شہروں کے لوگوں کو جہاد کی ترغیب و تلقین کے لیے لکھا گیا تھا، جرجی زیدان کا بیان ہے کہ اس کا ایک نسخہ کتبخانہ خدیویہ مصر میں اور ایک کوبرلی میں ہے۔

۱۱۔ **کتاب الاحکام**۔ کتاب کبیر فی الاحکام بھی اس کا نام ہے، اس کا انھوں نے اپنی تفسیر میں اکثر حوالہ دیا ہے، یہ ان کی بڑی ضخیم اور معرکۃ الآراء کتاب ہوتی مگر افسوس کہ مکمل نہ ہو سکی، اس میں وہ شریعت کے مسائل و احکام پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھنا چاہتے تھے، لیکن کتاب الحج ہی تک لکھ سکے جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے[1]، اگر یہ نامکمل کتاب بھی دستیاب ہو جاتی اور اس کو شائع کر دیا جاتا تو نہایت مفید علمی خدمت ہوتی۔

۱۲۔ **شرح بخاری**۔ بخاری شریف کی بھی ایک مکمل اور مبسوط شرح لکھنا چاہتے تھے، لیکن اس کو بھی مکمل نہ کر سکے[2]، بعض اہل سیر کا بیان ہے کہ صرف ایک جزء کی شرح لکھ سکے تھے۔

۱۳۔ **فضائل القرآن**۔ اس رسالہ کا کسی مصنف نے ذکر نہیں کیا ہے، ۱۳۴۸ھ میں مصر کے مشہور فاضل اور رسالہ المنار کے اڈیٹر سید محمد رشید رضا نے اس کو مطبع المنار مصر سے چھوٹی تقطیع کے ۲۰۰ صفحات میں شائع کیا ہے، یہ رسالہ دار المصنفین کے کتبخانہ میں ہے، اس میں قرآن مجید کے فضائل سے متعلق بخاری شریف میں جو روایتیں موجود ہیں ان کی تشریح، اور قرآن کے جمع و ترتیب اور کتابت وغیرہ کے متعلق مفید اور فاضلانہ بحثیں ہیں۔

مورخین اور تذکرہ نگاروں نے ابن کثیر کی تصنیفات کے ذکر میں لکھا ہے:

وشرح قطعۃ من البخاری[3]	بخاری شریف کے ایک حصہ کی شرح لکھی۔

قیاس ہے کہ یہ وہی رسالہ ہے، کیونکہ اس میں مصنف نے امام بخاری کی صحیح کے ابواب

---

[1] شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۳۱ [2] اعلام ج ۱ ص ۱۰۹، ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۹۰ وجلاء العینین ص ۲۲ وشذرات الذہب ج ۶ ص ۲۳۱ [3] شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۳۱

فضائل القرآن کی تمام روایتوں کو نقل کرکے ان کی تشریح کی ہے، جس میں ان روایات سے متعلق تمام ضروری مباحث کے علاوہ بہت سے دوسرے مفید اور علمی مسائل مثلاً تاریخ و ترتیب و جمع قرآن وغیرہ بھی آگئے ہیں، البتہ بخاری کے مذکورہ ابواب کی ان روایتوں کو قلم انداز کر دیا گیا ہے، جو قرآن مجید کی سورتوں کے فضائل کے متعلق ہیں،

اس کتاب کے مباحث کی نوعیت کو ظاہر کرنے کے لیے اس کے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب التفسیر کے بعد کتاب ابواب فضائل القرآن کا ذکر کیا ہے، اور اس کی ابتداء وہ باب کیف نزل الوحی و اول ما نزل سے کرتے ہیں، اس کے بعد وہ ابن عباس اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہما) کی یہ روایت نقل کرتے ہیں۔

بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں دس سال (بعثت کے بعد)
بمکۃ عشر سنین ینزل علیہ	اور مدینہ میں دس سال رہے، (اسی عرصہ میں)
القرآن وبالمدینۃ عشرا [1]	آپ پر قرآن مجید نازل ہوتا رہا۔

اس باب میں اور بھی حدیثیں ہیں، علامہ ابن کثیر نے ان سب کی تشریح کی ہے، مندرجہ بالا حدیث کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب ابواب فضائل القرآن کو کتاب التفسیر کے بعد درج کیا ہے، اس لیے کہ تفسیر قرآن کی اہمیت زیادہ ہے، اس لیے انھوں نے بھی اس کو اپنی کتاب میں مقدم رکھا ہے، ہم نے بھی اس سلسلہ میں ان کا تتبع اور اسی اصول کو اختیار کیا ہے۔

حدیث کی ابتداء میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے لفظ مہیمن کی جو تفسیر اور تشریح نقل کی گئی ہے

---

[1] بخاری شریف ج ۲ ص ۷۴۴،

اس سے امام بخاریؒ کا منشا سورہ مائدہ کی وہ آیت ہے جو توراۃ و انجیل کے تذکرہ کے بعد لائی گئی ہے یعنی

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ	اور ہم نے تمھاری جانب حق کے ساتھ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ	کتاب اتاری ہے جو اپنے سے پہلے کی کتابوں کی
وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (مائدہ)	تصدیق کرتی ہے اور ان کی نگرانی بھی

امام ابو جعفر طبریؒ نے مہیمناً علیہ کے ضمن میں ابن عباسؓ سے یہ تفسیر نقل کی ہے کہ مہیمن بمعنی امین ہے، یعنی قرآن پاک اپنے سے پہلے کی تمام کتابوں کا امین و شہید ہے۔ جیسا کہ ایک اور روایت میں بھی ان سے اس کی یہ تصریح ملتی ہے۔

سفیان ثوریؒ اور بعض دیگر ائمہ نے حضرت ابن عباسؓ سے مہیمنا علیہ کی تفسیر مؤتمنا نقل کی ہے، یہی تفسیر ائمہ سلف میں مجاہد، سدی، قتادہ، ابن جریج، حسن بصری (رحمہم اللہ) اور بعض دوسرے بزرگوں سے بھی منقول ہے۔

دراصل ہیمنہ، حفظ و ارتقاب کو کہتے ہیں، اسی لیے رقب الرجل الشئ وحفظہ وشہدہ کے موقع پر ہیمن فلان علیہ بھی کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں مہیمن بھی ہے، جس کے معنی الشہید علی کل شئی، الرقیب اور الحفیظ بکل شئی کے ہیں،

باقی امام بخاریؒ نے سندوں کے ساتھ جو یہ نقل فرمایا کہ اقام بمکۃ عشرین ینزل علیہ القرآن وبالمدینۃ عشرا تو یہ ان کا تفرد ہے، امام مسلم نے اس کی روایت نہیں کی ہے، البتہ امام نسائیؒ نے شیبان بن عبد الرحمن سے جو ابو عبید قاسم حضرت ابن عباسؓ کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں، اس کو اس طرح نقل کیا ہے۔

قال انزل القرآن جملۃ واحدۃ	حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ شب قدر
الی سماء الدنیا فی لیلۃ القدر	میں پورا قرآن سماء دنیا پر نازل ہوا اور
ثم نزل بعد ذالک فی عشرین	اس کے بعد ۲۰ سال تک (آنحضورؐ پر)

سنة ثم قرأ (وقرآنا فرقناه لتقرأه على الناس على مكث و نزلناه تنزيلا)

نازل ہوتا رہا، پھر یہ آیت پڑھی (جس کا مفہوم یہ ہے) ہم نے قرآن کو تھوڑا تھوڑا بتدریج نازل کیا تاکہ تم وقفہ وقفہ سے لوگوں کے سامنے پڑھو۔

اس روایت کی سندیں صحیح ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ طیبہ میں دس سال تک قیام پذیر رہنا تو متفق علیہ ہے لیکن مکہ میں نبی ہونے کے بعد ۱۳ سالوں تک قیام کرنا مشہور ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ۴۰ سال کی عمر میں وحی نازل ہونا شروع ہوئی تھی، اور ۶۳ سال کی عمر میں انتقال فرمایا جیسا کہ صحیح روایتوں سے ثابت ہوتا ہے، اس لیے ایک احتمال تو یہ ہو سکتا ہے کہ عشرے جو گنتی زیادہ تھی اس کو اختصار کی بنا پر حذف کر دیا گیا ہو کیونکہ اہل عرب عموماً عشرے زائد کسروں کو حذف کر دیتے تھے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ان دونوں حضرات نے حضرت جبرئیلؑ کے تعلق سے جو وحی آپ پر نازل ہوئی ہے صرف اس کو بیان کیا ہو، اس لیے کہ امام احمد نے یہ بھی روایت کی ہے کہ شروع میں حضرت میکائیل کے واسطے سے وحی آتی تھی، اور بعد میں حضرت جبرئیل کے واسطے آنی شروع ہوئی ہے۔[1]

فضائل قرآن سے اس حدیث کی مناسبت یہ ہے کہ نزول قرآن کی ابتدا جس طرح ایک اچھے مقام یعنی بلد حرام میں ہوئی، اسی طرح وہ ایک مقدس اور متبرک زمانہ یعنی رمضان شریف میں نازل ہونا شروع ہوا، اس طرح گویا زمان و مکان دونوں کا تقدس اور فضیلت اس کو حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ رمضان کے مہینہ میں تلاوت کی کثرت اور زیادتی مستحب ہے۔ کیونکہ اول تو اس مہینہ کا

---

[1] حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان دونوں توجیہوں کے ساتھ ایک اور توجیہ بھی نقل کی ہے، اور وہ یہ کہ ابتدا میں ایک زمانہ میں ۳ سال تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا، اس لیے صرف ۱۰ سالوں کا ذکر ہے (ملاحظہ ہو ۹/۵ ص ۳)

قرآن نازل ہوا تھا، ثانیاً حضرت جبرئیلؑ ہر سال اسی ماہ میں آپ سے قرآن کی تکرار کرتے تھے، اور جس سال آپ کا وصال ہوا اس سال دوبارہ تکرار کی۔

اس حدیث میں اس کی وضاحت بھی ہے کہ قرآن کا کچھ حصہ مکہ میں اور کچھ مدینہ میں نازل ہوا، مکی حصہ ہجرت سے قبل کا اور مدنی ہجرت کے بعد کا ہے، ہجرت کے بعد جو حصہ نازل ہوا وہ سب مدنی کہلاتا ہے، خواہ وہ مدینہ کے علاوہ کہیں بھی حتیٰ کہ مکہ اور عرفہ میں بھی نازل ہونے والا مدنی ہی کہلائے گا۔

بعض سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے پر اتفاق ہے، اور بعض کے متعلق اختلاف ہے، بعض لوگوں نے اس کے قاعدے اور ضابطے بنانا چاہے ہیں لیکن ان میں زحمت و تنگی بھی ہے، اور وہ محل نظر بھی ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جن سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات میں سے، کوئی حرف آگیا ہے، وہ بقرہ اور آل عمران کے علاوہ سب مکی ہیں، اور جن میں یا ایہا الذین آمنوا آیا ہے وہ مدنی ہے لیکن جن میں یا ایہا الناس کے الفاظ ہیں، ان میں دونوں کا احتمال ہے، لیکن زیادہ تر مکی سورتوں میں یہ الفاظ ملتے ہیں، مگر بعض مدنی سورتوں میں بھی ہیں، جیسے سورۂ بقرہ میں ہے:

یا ایہا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم الخ اور یا ایہا الناس کلوا مما فی الارض حلالاً طیباً الخ

ابو عبید علقمہ کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ قرآن حکیم میں [یا ایہا الذین آمنوا] جہاں بھی ہے وہ مدینہ میں نازل ہوا ہے اور یا ایہا الناس جہاں ہے وہ مکہ میں، نیز وہ میمون بن مہران کے حوالے سے کہتے ہیں کہ قرآن میں جہاں [یا ایہا الناس] اور [یا بنی آدم] ہے وہ مکی ہے اور جہاں [یا ایہا الذین آمنوا] وہ مدنی ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بعض سورتیں دو مرتبہ نازل ہوئی ہیں۔ ایک مرتبہ تو مدینہ میں اور ایک مرتبہ مکہ میں، واللہ اعلم بالصواب۔

بعض لوگ مکی سورتوں کی کچھ آیتوں کو مستثنیٰ کر کے انھیں مدنی بتاتے ہیں۔ جیسے سورۂ حج وغیرہ

کی آیات۔ لیکن اس سلسلہ میں کوئی قطعی اور صحیح بات کہنا مشکل ہے۔

ابو عبید علی بن ابی طلحہ سے روایت کرتے ہیں کہ مدینہ میں سورۂ بقرہ، آل عمران، نسا، مائدہ، انفال، توبہ، حج، نور، احزاب، الذین کفروا (محمد) فتح، حدید، مجادلہ، حشر، ممتحنہ، حواریون (صف) تغابن، یا ایہا النبی اذا طلقتم (طلاق)، یا ایہا النبی لم تحرم (تحریم) فجر، واللیل اذا یغشیٰ (لیل) انا انزلناہ فی لیلۃ القدر [قدر] لم یکن [بینہ] اذا زلزلت [زلزال] اذا جاء نصر اللہ [نصر] مدنی ہیں، اور بقیہ سب سورتیں مکی ہیں۔

ابن ابی طلحہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے ان شاگردوں میں ہیں جو ان سے تفسیروں کی روایت کرتے ہیں، مذکورہ بالا روایت ان سے صحیح سندوں کے ساتھ مشہور اور ثابت ہے، لیکن اس فہرست میں انھوں نے بعض ایسی سورتوں کو شامل کر لیا ہے جن کا مدنی ہونا محلِ نظر اور قابلِ غور ہے، نیز اس میں بعض مدنی سورتیں مثلاً حجرات اور معوذتین وغیرہ شامل نہیں ہیں"

اس طویل تشریح کو اس لیے نقل کیا گیا ہے کہ اس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ ابن کثیرؒ نے احادیث کی کس قدر جامع اور مفصل شرح کی ہے، اس رسالہ کا زیادہ قابل قدر حصہ وہ ہے جس میں جمع و ترتیب قرآن سے بحث کی گئی ہے، یہ حصہ صفحہ ۲۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۰۲ پر ختم ہوتا ہے، اس کی صحیح اہمیت مطالعہ کے بعد ہی ظاہر ہو سکتی ہے۔

ابن کثیر بالغ نظر محدث تھے اس لیے انھوں نے اس رسالہ میں بڑی بصیرت سے بھی کام لیا ہے اور امام بخاریؒ کے بعض خیالات پر تنقید اور ان کا ابطال کیا ہے، مثلاً ایک باب القراۃ عن ظہر قلب کا باندھا ہے، اس کے متعلق ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں:۔

"ترجمۃ الباب سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب کا منشا یہ ہے کہ بغیر مصحف کے یادداشت سے قرآن پڑھنا زیادہ بہتر اور افضل ہے، واللہ اعلم لیکن اکثر علماء نے یہ صراحت کی ہے کہ مصحف سے قرآن پڑھنا افضل ہے،

اس لیے کہ اس صورت میں قاری تلاوت کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کو دیکھتا بھی ہے اور مصحف کو دیکھنا بجائے خود ایک عبادت ہے، جیسا کہ متعدد اکابر سلف نے تصریح کی ہے، انھوں نے اس شخص کو ناپسند کیا ہے جس کا پورا دن گذر جائے اور اس کو مصحف دیکھنے کا اتفاق نہ ہو" اس سلسلہ کی بعض اور باتیں تحریر کرنے کے بعد آخر میں فرماتے ہیں: امام بخاری کا منشا، حدیث سہیل کو نقل کر کے یہ بتانا ہے کہ حافظہ سے قرآن پڑھنا مصحف میں دیکھکر پڑھنے سے افضل اور زیادہ بہتر ہے، لیکن یہ بات نگاہ کو کھٹکتی ہے، کیونکہ یہ ایک خاص شخص کا معاملہ تھا، جو ممکن ہے اچھی طرح لکھنا پڑھنا نہ جانتا رہا ہو، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم رہا ہو، اس لیے اس روایت میں یادداشت سے تلاوت کرنے کی فضیلت کی کوئی دلیل نہیں اور نہ اس کا ثبوت ہے کہ جو لوگ اچھی طرح لکھنا پڑھنا جانتے ہوں، ان کے لیے بھی ناواقف لوگوں کی طرح یادداشت سے قرآن کی تلاوت کرنا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ اگر اسکا یہی مقصد ہوتا تو آپ خود اپنے متعلق یادداشت سے قرآن کی تلاوت کرنے کا ذکر ضرور فرماتے اور یہ بات زیادہ موزوں اور بہتر بھی ہوتی، کیونکہ آپؐ امی تھے۔

حدیث کے سیاق سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا منشا صرف اس قدر ہے کہ ان صحابی کو یہ سورتیں یاد تھیں، اس لیے ان کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اپنی بیوی کو بھی یہ سورتیں سکھا دیتے اور یہ ان کا معاوضۂ نکاح ہو جاتا، باقی اس کا کوئی سوال ہی نہیں ہے کہ یادداشت سے قرآن پڑھنا دیکھکر تلاوت کرنے سے بہتر ہے یا نہیں"

ان دو مثالوں سے اس رسالہ کی اہمیت اور نوعیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے، اسلیے صرف ان ہی پر اکتفا کیا گیا، اگر ابن کثیر نے بخاری کی مکمل شرح لکھی ہوتی تو آپ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس قدر جامع اور فاضلانہ ہوتی۔

بیسویں صدی میں قانون اسلامی کی اہمیت

از جناب آصف فیضی بمبئی

لفٹنٹ جنرل سر جان گلب نے اپنی کتاب "دی گریٹ عرب کانکوئسٹس" ان الفاظ پر ختم کی ہے:۔

"مسیحیت اور اسلام کے موجودہ تعلقات پر کچھ کہنا ضروری ہے، جیسا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ یہودیت، مسیحیت اور اسلام کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے، اگر ان کو الگ کرکے دیکھا جائے تو ان میں گہرے اختلافات نظر آئیں گے، لیکن اگر ان کا موازنہ ہندو مذہب، بودھ مت اور لادینی اشتراکیت سے کیا جائے تو اختلاف کے باوجود یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں اتحاد نظر آئے گا۔ پھر بھی عام خیال یہ ہے کہ مسیحیت اور اسلام ایک دوسرے کے بڑے حریف ہیں، جو محض وہم ہے، ان اختلافات کی بنا سیاسی ہے نہ کہ مذہبی۔"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے عرب فاتح بازنطینی ہی کو اپنا خاص دشمن سمجھتے تھے، اور جب انھوں نے شمالی افریقہ اور ہسپانیہ کو فتح کیا، پھر جب ترکوں نے بلقان پر حملہ کیا اور زار روس سے مدت تک برسرپیکار رہے تو ان تمام جنگوں کا نشانہ عیسائی ہی تھے، ان کے مقابلہ میں ہندوستان کے ہندو مسلم جھگڑے بہت ہی چھوٹے پیمانے پر تھے، اگر فلسطین کے پچھلے چالیس سال کے واقعات نظر انداز کر دیے جائیں تو یہودیوں اور مسلمانوں میں جنگ و جدال کم ہی ہوئے،

عیسائیوں اور مسلمانوں کی دیرینہ مناقشت کے اسباب مذہبی نہیں بلکہ سیاسی اور جغرافیائی ہیں، آج جب کہ مادہ پرست دہریے خدا کے وجود سے منکر ہو رہے ہیں اور روحانی اقتدار کو چیلنج (Challenge) کر رہے ہیں، ایسے وقت میں عیسائی اور مسلمان باہم مل کر ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اس معاملہ میں باہمی تعاون کا بہت امکان ہے۔"

چار صدیوں کی گمنامی کے بعد دنیائے عرب ایک بار پھر تاریخ میں اپنا مقام پیدا کر رہی ہے اس لیے یہ ہمارا فرض ہے اور اس میں ہماری بھلائی بھی ہے کہ ہم ان قوموں کی تاریخ اور ذہنیت کا بغور مطالعہ کریں جن کا گذشتہ زمانے میں ایک نمایاں اور ممتاز تاریخی ریکارڈ رہ چکا ہے۔

گلب پاشا کی یہ رائے بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن اس معاملہ میں اور اسباب بھی ہیں، ایک تو یہ کہ ناصر اور ان کے ہم خیالوں کی "عرب قوموں کی کامن ویلتھ" بنانے کی کوشش کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کو عملی جامہ پہنانے میں خواہ کتنی ہی دیر لگے، لیکن سنہ ۱۹۴۵ء میں اس خیال کے تحت "عرب لیگ" کے نام سے جس تحریک کی ابتدا کی گئی تھی دوسرے عرب ممالک اس کو قبول کرکے عملی صورت میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور میری رائے میں اس میں کامیابی کے آثار صاف نظر آرہے ہیں، دوسرے تیل کی پیداوار میں غیر معمولی اضافے اور اس میں امریکہ اور دوسری بین الاقوامی ایجنسیوں کے سرمایہ لگانے کی وجہ سے یہ اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم ان قوموں اور ان کے امکانات کے متعلق معلومات حاصل کریں، تیسرے مشرق وسطی اور جنوبی ایشیا کی مضبوط اور موثر قیادت سے جو طاقت ان ملکوں میں آرہی ہے وہ کچھ کم اہم نہیں ہے، ترکی میں (سنہ ۱۹۱۰–۲۵ء) کمال اتاترک، تونس میں (سنہ ۱۹۴۵–۵۰ء) حبیب بورقیبہ (ابو رقیبہ) پاکستان میں (سنہ ۱۹۴۰–۴۷ء) محمد علی جناح اور ہندوستان میں (سنہ ۱۹۲۵–۵۰ء) ابوالکلام آزاد

(۱۹۵۰ء کے بعد) ۔ مصر میں جمال عبدالناصر، الجزائر (۱۹۶۲ء) میں بن بیلا خود رو لالہ کی طرح نہیں ہیں جو صبح کو پیدا ہوئے، رات بھر رہے اور دوسرے دن مرجھا کر طاق نسیاں کے حوالے ہو گئے۔
اس سے صاف ظاہر ہے کہ عالم اسلام اب خواب میں نہیں ہے، اس کے سیاسی لیڈر ابھی ختم نہیں ہوئے ہیں، اور اس کی روح مردہ ہو کر کتابوں اور قبروں میں دفن نہیں ہو چکی ہے، اور اس کے مفکرین اب حشیش یا افیون پی کر دن کو خواب نہیں دیکھتے، اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم مذہب اسلام، اس کے طریق زندگی اور اس کی ثقافت کا مطالعہ کریں، اور آج کی پوری دنیا کو اسلام کی تفہیم کی ضرورت ہے۔ اور اسلام کو بھی زمانہ کے دوش بدوش چلنا ہوگا، عربوں میں ایک کہاوت ہے کہ "ابن آدم اپنے باپ سے زیادہ اپنے عہد سے قریب ہوتا ہے"۔

اسلام کی عالمی نوعیت کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے اسلامی قانون اور علم شریعت کا جاننا بہت ضروری ہے، امام غزالی فرماتے ہیں:

"قانونِ شریعت مسلمانوں کے لیے روزانہ کی زندگی میں لابدی نان شبینہ کا درجہ رکھتا ہے اس کے اصول سب مسلمانوں کے لیے فرض ہیں۔ جو شخص اس کے قانون اور ضابطوں سے انکار کرے گا وہ منکر ایمان اور مرتد ہوگا۔ شریعت کا علم ہر مسلمان کے لیے اس لیے ضروری ہے کہ وہ ان کو زندگی کا سیدھا راستہ دکھلاتا ہے، لیکن ہر مسلمان اس کو اپنی استعداد کے موافق حاصل کرتا ہے، اس کے لیے قانونی موشگافیوں میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہیں، البتہ علما، کا ایک ایسا طبقہ بھی ہونا ضروری ہے جو قانون کا مطالعہ ذاتی ضروریات سے بلند ہو کر کرے، یہ خیال غلط ہے کہ قوم کی ضروریات سے زیادہ قانون کے مطالعہ سے شغف رکھنا خدا کو پسندیدہ ہے۔ فقہ اس دنیا کا علم ہے، جو شخص اس پر عامل ہوگا وہ ظاہری طور پر مسلمان ہی سمجھا جائے گا لیکن اخروی نجات کے لیے وہ پورا ایمان رکھتا ہے

یا نہیں — یہ ایک الگ سوال ہے"۔
غزالی کی حمایت کرتے ہوئے ایک جدید عالم پروفیسر جوزف شاخت (کولمبیا یونیورسٹی نیویارک) نے بجا طور پر لکھا ہے کہ

" اسلامی قانون اسلام کے احکام کا ملخص اور اسلامی طریق زندگی کا خاص مظہر ہے، مسلمانوں کے لیے اسلامی قانون ہمیشہ سے مذہبی عقیدہ سے زیادہ عملی طور پر کارآمد اور اہم رہا ہے، اور آج بھی ہے، مغربی خیالات کے اثر سے آج کل روایت پرستی اور جدید طرز زندگی میں جو کشمکش جاری ہے، اس میں اسلامی قانون فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے، مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک میں آج کل جو قانونی تبدیلیاں ہو رہی ہیں، ان کو سمجھنے کے لیے قانون کا گذشتہ نظریہ، اس کا عمل اور اس کی صحیح شکل کو سمجھنا ضروری ہے"۔

لیکن صرف قانونی معاملات ہی شریعت سے یا فقہ سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ مذہب اور اخلاقیات بھی اس کا جز مانے جاتے ہیں، اور جس طرح خالص قانونی معاملات مثلاً نکاح، طلاق، ہبہ، وقف اور وراثت کے احکام و قوانین امہات کتب فقہ میں ہیں، اسی طرح روزہ، نماز، زکوٰۃ، حج اور جہاد کے مسائل اور اخلاقی تعلیمات بھی ہیں، اور ہدایہ، منہاج، دعائم الاسلام اور ادب القاضی وغیرہ میں اس کے مستقل ابواب ہیں، اسی بنا پر ہندوستان میں اخلاقی احکام کو قانون شریعت سے ملا دینے کا سوال کئی بار کتابوں اور قاضیوں کے فیصلوں میں زیر بحث رہا ہے جس کی مثال جسٹس محمود کا وہ فیصلہ ہے جو انھوں نے "گوبند دیال اور عنایت اللہ" کے مقدمہ میں کیا تھا۔

قدیم مسلمان علما نے سب سے زیادہ اہمیت قانون کے مطالعہ کو دی ہے، امام نووی اپنی تصنیف "منہاج" کو ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں:۔

" خدا کے حضور میں اطاعت کے اظہار اور اپنے قیمتی وقت کے صحیح استعمال کا سب سے بہتر طریقہ

قانون کا مطالعہ ہے۔"

چنانچہ قدیم اسلامی ادب کا بہت بڑا حصہ قانون (شریعت اور فقہ) اور اس کی مختلف شاخوں پر مشتمل ہے، جو "العلوم الشرعیہ" کہلاتی ہیں۔

اس موقع پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی کونسی ایسی اہمیت ہے کہ ان کی طرف اتنی توجہ کی جائے اور ان کی تعداد ہی کتنی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عام تخمینہ کے مطابق مسلمان دنیا کا تیسرا سب سے بڑا مذہبی گروہ ہیں۔ عیسائیوں کی تعداد نو ارب، بدھوں کی سات ارب اور مسلمان چار، سوا چار ارب ہیں، جو دنیا کی آبادی کا ساتواں حصہ ہوتا ہے، ملکوں کے لحاظ سے ان کی آبادی حسب ذیل ہے:-

انڈونیشیا :-	۷ کرور	پاکستان :-	۶½ کرور
ہندوستان :-	۶ "	نائجیریا :-	۳ کرور ۲۰ لاکھ
عربستان (خالص)	۳ "	چین اور روس :-	۲ کرور
مصر :-	۲½ "	ایران	۲½ "
ترکی :-	۳ کرور		

اس کے علاوہ مسلمان بلقان کی ریاستوں، وسط ایشیا، مداغاسکر اور لنکا میں بھی آباد ہیں، عرب اور افریقہ کے مسلمانوں کی صحیح تعداد بتانا مشکل ہے، لیکن اتنا مسلّم ہے کہ ہندوستانی برصغیر میں حنفی سنی مسلمانوں کی تعداد ایک کرور دس لاکھ ہے[1]، جن میں بڑی حد تک زبان، نسل اور مذہب کے لحاظ سے وحدت ہے، ان کے سماجی زندگی کے اصول بھی ایک سے ہیں، اور انکی اپنی ایک زبان ہے، جس میں ان کی ثقافت اور ان کے کلچر کے اثرات ہیں۔ اردو خالص ہندستانی نژاد

[1] معارف۔ سنی حنفی مسلمانوں کی تعداد ہندوستان میں چار کرور سے کم نہ ہوگی۔

زبان ہے، جو مغربی ہندی سے ماخوذ ہے؛ اس میں عربی، فارسی، ہندی، انگریزی اور پرتگالی کے الفاظ سب گھل مل گئے ہیں۔ اس کا ایک وسیع اور ترقی پذیر ادب ہے، جس میں مسلم قانون، دینیات، تاریخ اور شاعری خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس اہم قوم کے قانون کو "محمڈن لا" کہتے ہیں۔ تھوڑے شیعوں کو چھوڑ کر ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کی اکثریت سنی حنفی ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں محمڈن لا کی یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ "اسلامی قانون شریعت کا وہ جزو جو ہندوستان میں آئین ہند کے تحت مسلمانوں کے ذاتی قانون کی حیثیت سے جاری ہے" یہ قانون قرآن، سنت، اجماع اور قیاس پر مبنی ہے، جو انگلستان کے کامن لا (Common Law) اور اکوئٹی (equity) سے بھی متاثر ہوا ہے۔ جن کو قدیم انگریزی میں justice equity and good cience کہا جاتا ہے۔ محمڈن لا کے دوسرے ماخذ رواج اور عادت یا عرف ہیں اور بڑی بڑی حکومتوں کے آئین کے صلح نامے بھی ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ یہ اپنے ماخذ کے لحاظ سے کوئی علیحدہ نظام نہیں ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ پچھلے تین سو سال کی سماجی زندگی کے تغیرات سے اور مغربی ثقافت اور انگریزی زبان کے اثر سے اس میں بعض تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔

اس قانونی اصول (محمڈن لا) کا سارا ادب انگریزی زبان میں ہے، سب سے پہلے Case Law کو لیجئے، پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کے فیصلوں کی ۷۰ جلدیں موجود ہیں جو "انڈین اپیل" کے نام سے موسوم ہیں۔ اس کے علاوہ سرکاری رپورٹوں کی جلدیں ہیں جو بمبئی، کلکتہ اور مدراس ہائیکورٹوں میں شاہی چارٹر سے داخل کی گئی ہیں۔ اور ان کی ہر ایک کورٹ میں پچاس جلدیں موجود ہیں، الہ آباد، لکھنؤ، پنجاب، ناگپور اور دوسرے ہائی کورٹوں کے فیصلے ہیں، اور اب ہندوستان اور پاکستان کے سپریم کورٹ (Supreme Court)

کے فیصلوں کو بھی دہلی اور کراچی کے فیصلوں میں شامل کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں برطانوی حکام کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں، مثلاً سر ولیم مکناٹن کی تصنیف اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے، جو ۱۸۲۵ء میں لکھی گئی، اس کے بعد ہیملٹن نے ہدایہ کا اور بیلی نے فتاوی عالمگیری کا ترجمہ کیا، پھر سدرلینڈ، رمسی، مورلی، ولسن اور بیکلین کی تصنیفات آتی ہیں، ان کے بعد ہندوستانی مصنفوں میں امیر علی، سرکار، عبدالرحیم، طیب جی اور ملا وغیرہ کی کتابیں ہیں، ملا متعدد کتابوں کے مصنف بمبئی ہائیکورٹ کے جج اور پریوی کونسل کی جوڈیشیل کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔

اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان و پاکستان کا مروجہ محمڈن لا انگریزوں، مسلمانوں، ہندوؤں اور پارسیوں کی مشترکہ ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے، اور عدالتوں میں جو محمڈن لا جاری ہے اس کا مطالعہ آسانی سے انگریزی زبان میں کیا جاسکتا ہے، فتاوی کا اچھا خاصہ ادب بھی اردو میں موجود ہے، اور ہندوستان کے بہت سے اکابر علما کے فتاوے کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں، ہندوستانی مسلمانوں نے عربی، فارسی اور اردو میں دینی علوم خصوصاً حدیث، فقہ اور اس کے متعلقہ فنون میں قیمتی اضافے کیے ہیں، اور ہندوستان نے عالم اسلام کو حنفی قانون میں کم از کم ایک کتاب ایسی دی ہے جو کلاسیکی حیثیت رکھتی ہے، یہ کتاب فتاوی عالمگیری ہے، جو شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے مدون ہوئی تھی عربی میں اس کی چار جلدیں ہیں اور اس کا ترجمہ انگریزی اور اردو میں بھی ہو چکا ہے۔

مغرب کے تمام علما اس بات پر متفق ہیں کہ اسلامی تہذیب یونان کی کلاسیکی تہذیب، لاطینی ثقافت اور موجودہ مغربی تہذیب میں رابطہ کی حیثیت رکھتی تھی، گو عربوں نے ڈرامہ کی طرف توجہ نہیں کی اور طنز و مزاح سے بھی ان کو دلچسپی نہ تھی لیکن کلاسیکی شاعری، قانون، دینیات، تاریخ

طب اور علوم ریاضی کا انھوں نے بہت بڑا ادب چھوڑا ہے، جس میں صرف تھوڑے حصے کا پوری طور سے مطالعہ ہو سکا ہے، پروفیسر لمیٹ اٹر کے تخمینہ کے مطابق تقریباً دو لاکھ مخطوطے ترکی میں موجود ہیں، جن میں سے ایک لاکھ چوبیس ہزار تنہا استنبول میں ہیں، بعض یورپی کتب خانوں میں بھی اچھے ذخائر ہیں، مثلاً پیرس کا نیشنل کتب خانہ (ببلیوتیک)، برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری، ڈبلن کے چسٹر بیٹی کے ذخیرے کی شاندار قلمی تحریریں، اور منقش مخطوطے اور قاہرہ، دمشق، یمن اور ہندوستان کے بادشاہوں اور رئیسوں کے ذخیرے جو اب تک دہلی، رامپور، پٹنہ، علی گڑھ، لکھنؤ، حیدرآباد اور کلکتہ میں موجود ہیں، یہ سب اسلامی تہذیب کی بڑی قیمتی میراث ہیں، اور یہ دعوی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں ابھی تین لاکھ ایسے مخطوطے موجود ہیں جن کا سائنٹفک مطالعہ نہیں کیا گیا ہے، اور عربی، فارسی، ترکی اور اردو میں تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ان میں بے مثل خزانہ پوشیدہ ہے، اسلامی قانون اور اس سے متعلق موضوعات کا سائنٹفک مطالعہ موجودہ تحقیق اور تفتیش کے لیے بہت اہم ذریعہ ہے، رومی اور یونانی ادب العالیہ کے تشنہ کام محققین کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی ضرورت ہے، کیونکہ اس موضوع پر ابھی کوئی کام نہیں ہوا ہے، استنبول کی مسجدوں، دمشق، قاہرہ، فارس اور تونیشیا کے مدرسوں اور ہندوستان و پاکستان کے کتب خانوں میں ابھی معلوم نہیں کتنے گوہر نایاب پوشیدہ ہیں، جن کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

مجھے اس پر بھی زور دینا ہے کہ "محمڈن لا" ہندوستان میں جاری ہے، اس کے مطالعہ کے ابتدائی مراحل میں عربی یا فارسی کی قابلیت کی چنداں ضرورت نہیں ہے، زیادہ اہم نکات جو عدالتوں کے فیصلوں میں زیر بحث آئے ہیں وہ سرکاری ترجموں پر مبنی ہیں جو بڑی حد تک قابل وثوق ہیں، ہندوستان اور پاکستان کی لا رپورٹس اور محمڈن لا کی خاص کتابیں انگریزی میں ہیں، ہندوستان میں محمڈن لا کے قدیم اساتذہ میں سے چند ہی عربی اور فارسی کے عالم تھے۔

ابتدائی دور کے بیشتر انگریز مصنفین باستثنائے بیلی مترجم فتاویٰ عالمگیری اور ہملٹن مترجم ہدایہ، کلاسیکی عربی سے بالکل ناواقف تھے، بمبئی اور دوسرے مقامات میں پندرہ سال قانون کے استاذ کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ

(ا) ہندوستان اور پاکستان میں محمڈن لا کے ابتدائی مطالعہ کے لیے عربی ناگزیر نہیں ہو البتہ گہرے مطالعہ کیلئے اسکی قابلیت ضروری ہے۔

(ب) مذہب اسلام اور اسلامی تاریخ و تہذیب کا مطالعہ بیحد ضروری ہے،

(ج) اعلیٰ تحقیق یا پروفیسر شپ یا ریڈر شپ کے لیے عربی اور کوئی دوسری زبان مثلاً فارسی، اردو یا ترکی کی لیاقت ضروری ہے،

(د) دینی علوم میں ہندوستانی علماء نے جو اضافے کیے ہیں اور دینی علوم پر جو عالمانہ رسالے نکلتے ہیں، ان کے مطالعہ اور ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کے مذہب، قانون اور علم الاخلاق پر تحقیق کرنے والوں کے لیے اردو زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانوں میں ہندوستانی کتابوں اور مخطوطوں کی فہرست اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس موضوع پر کام کرنے والے یورپی علماء آسانی سے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اسلامی قانون میں خدا کی ذات ہی قانون کا منبع اور قرآن کریم اس کا بنیادی ماخذ ہے، اس کے بعد حدیث نبوی کا درجہ ہے، یہ دونوں نص یعنی لازمی ضابطے کی حیثیت رکھتے ہیں اور وحی کے اساس پر انسانی دماغ اور ذہنی جستجو نے فقہ یا شریعت کا ڈھانچہ کھڑا کیا ہے، مسلمان اپنے مقدس قانون کو "فقہ" اور "شریعت" کا نام دیتے ہیں۔ شریعت نام ہے اُن تمام دینی، قانونی اور اخلاقی ضابطوں کا جنھیں مسلمان قانون دانوں نے پختگی تک پہنچایا ہے، مسلمان اس کو "محمڈن لا" نہیں کہتے، اس لیے کہ اسلام میں قانون کا منبع خدا کی ذات ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک انسان اور خدا کے پیغمبر ہیں، اور ان کو یہ مرتبہ

وحی کے ذریعہ ملا، جو کچھ ان پر نازل ہوا اس کو وحی کہتے ہیں، قرآن پاک میں بتصریح اس کا ذکر ہے کہ آپ حضرت آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کی طرح ایک پیغمبر تھے، اور یہ سب کے سب خدا کے سچے رسول تھے، اور ان کے لائے ہوئے مذاہب سچے اور قابل احترام ہیں شریعت کے اصول و ضوابط انسانوں کی مادی اور روحانی اصلاح کا ذریعہ ہیں، جس طرح ہندو مذہب میں "دھرم" اور نصرانیوں میں "توراۃ" کو سمجھا جاتا ہے، اس لیے شریعت کا مطالعہ تینوں سامی مذاہب نصرانیت، عیسائیت اور اسلام میں مشابہت و تقابل اور تنقیدی مواز نہ کے لیے سود مند ہوگا۔

ادھر چند برسوں کے اندر رسم و رواج، انگلش لا، اکوئٹی ([illegible]) اور شخصی حکومتوں کے باہمی صلاح و مشورے نے قانون کی اساس پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے اور ان سب پر ابھی بہت کام کرنا باقی ہے، خاص طور سے اس کی تحقیق کرنا ہے کہ امام محمد الشیبانی کس حد تک بین الاقوامی قانون (International law) کے اصل بانی تھے،

یہ تعجب کی بات ہے کہ اسلامی قانون (شریعت، فقہ) کی طرف، جس کا تعلق چار ارب انسانوں سے ہے جو مختلف ملکوں میں آباد ہیں، بہت کم توجہ کی جاتی ہے، اسی طرح ہندو لا (دھرم شاستر) کی طرف بھی، جس کا تعلق برصغیر ہند و پاک میں بسنے والے ۳۰ کروڑ انسانوں سے ہے، بہت کم توجہ کی گئی ہے، اس لیے ہم کو امید ہے کہ مغربی دنیا خصوصاً ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں اسلامی فقہ کے مطالعہ کی اہمیت محسوس کی جائے گی، اس سلسلے میں میرا مشورہ یہ ہے کہ یونیورسٹیاں اپنے نصاب میں اسلامی قانون کے مطالعہ کی آسانی پیدا کرنے کے لیے حسب ذیل تشکلیں اختیار کریں۔

(۱) قدوری اور رسالہ امام شافعی کا متن عربی کے ڈگری کورس میں اور محمصانی کی تاریخ التشریع الاسلامی کا انگریزی ترجمہ لازمی مطالعہ کے لیے رکھا جائے۔

(۲) اسلامی فقہ کو ڈگری امتحانوں میں رومن لا کے متبادل جگہ دیجائے۔

(۳) سوشیالوجی اور ازمنہ وسطی کی تاریخ کے کورس میں اسلامی فقہ ایک عام مضمون کی حیثیت سے شامل کیا جائے۔[1]

---

[1] یہ مضمون انگریزی میں "The Relevance of Muhammadan Law in the Twentieth century" کے عنوان سے کیمبرج لا جرنل ۱۹۶۳ء ص ۲۶۱ میں بھی چھپ چکا ہے، اس لیے اس کے حوالے یہاں قلم زد کر دیے گئے ہیں۔

جمع و تدوین قرآن

یو۔ پی گورنمنٹ کے مشہور آئی سی۔ ایس آفیسر جناب سید صدیق حسن صاحب مرحوم کا جمع و تدوین قرآن کے عنوان سے جو مضمون معارف میں کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا، اور جس کو اہل نظر نے بیحد پسند کیا تھا، اس کو معارف پریس نے ان کی یادگار میں الگ کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا ہے، اس میں فاضل مصنف نے قرآن کی جمع و تدوین کی تاریخ پر بڑی محققانہ بحث کی ہے، اور بہت پرزور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید عہد نبوی ہی میں مدون اور مکمل ہو گیا تھا، یہ رسالہ علماء و محققین خصوصاً قرآن کے طلبہ کے لیے بیحد مفید ہے، ایک آئی، سی، ایس کے قلم سے جس کی ساری عمر انتظامی اور عدالتی کاموں کی انجام دہی میں گذری ہو، ایسے اہم اور تاریخی مسئلہ پر اتنا محققانہ اور فاضلانہ مضمون بہت سبق آموز اور قابل قدر ہے۔

قیمت ۶ر

"منیجر"

ایک صوفی شاعر
حضرت شاہ نیاز احمد نیازؒ

از

جناب ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب ادیب شاہ باد بریلی

حضرت شاہ نیاز احمد نیاز صاحب بریلوی کا شمار ممتاز صوفی شعراء میں ہے، آپ نے دو دیوان یادگار چھوڑے ہیں، ایک فارسی، دوسرا اردو، میرے پیش نظر ان کے دواوین کے نولکشوری نسخے ہیں جو ۱۸۷۶ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئے، ان دواوین کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نیاز احمد صاحب نیاز تصوف کے مقامات و احوال سے پوری طرح آشنا تھے، ان کے کلام میں سراسر تصوف ہے، وہ خود فرماتے ہیں ؎

مقام اے نیاز اندر جہاں ہر کس نمیداند
فرید دہر و شمس و قمر و ہمرنگ منصورم

اردو شاعری میں صوفیانہ خیالات کا سراغ اس کے ابتدائی دور ہی سے ملتا ہے، شمالی ہند کے قدیم دور شاعری تک صوفیانہ خیالات اردو غزل کی آبرو رہے ہیں، اور ایسے شاعر بھی جنکا تصوف میں کوئی درجہ نہ تھا، تصوف کے مضامین پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے، کیونکہ اس وقت بقول مصحفی درویشی اور شاعری دوش بدوش چل رہی تھیں، اس زمانے کے مشہور صوفی شعراء شرف الدین مضمون متوفی ۱۷۴۵ء شاہ مبارک آبرو متوفی ۱۷۵۰ء، مرزا مظہر جانجاناں متوفی ۱۷۸۱ء، خواجہ میر درد متوفی ۱۷۸۵ء اور ظہور الدین حاتم متوفی ۱۷۹۱ء ہیں، یہ سب درویش صفت اور صاحب نسبت شاعر تھے، ان کے کلام میں اعلیٰ صوفیانہ

خیالات، فکر کی رفعت اور عشق کی گرمی نمایاں ہے، اور ان کے دواوین صوفیانہ شاعری کے تنوع مضامین کے حامل ہیں، ان کے علاوہ پرانے تذکروں میں صوفی شعراء میں شاہ بلول اور خواجہ حسن وغیرہ کا ذکر ملتا ہو، مگر ان سے ہماری واقفیت واجبی سی ہے،

اس دور کے بعد کے شعراء کے کلام میں بھی صوفیانہ خیالات ملتے ہیں، اور بعض شعراء نے تو صوفی نہ ہوتے ہوئے بھی صوفیانہ خیالات کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ منزل سلوک کے سالک تھے، ان کے کلام میں وحدت الوجود، فنا، فقر و استغنا، بے ثباتی عالم اور خوف و رجا، کے مضامین بکثرت ملتے ہیں، اور ان کا کلام اردو شاعری کی آبرو ہے،

حضرت شاہ نیاز احمد نیاز صاحب دل درویش تھے، ان کی شاعری کی جڑیں اسلامی روایات میں پیوست تھیں، آپ کا مولد سرہند تھا، جہاں آپ ۱۱۷۳ھ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد حکیم شاہ رحمت اللہ بھی درویش تھے، حضرت شاہ نیاز احمد نیاز حضرت مولانا محمد فخر الدین صاحب چشتی نظامی قدس اللہ سرہٗ (پیدائش ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء وفات ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء) کے زمانہ میں تشریف لائے تھے، آپ کو مصحفی نے دہلی میں دیکھا تھا، وہ لکھتے ہیں:-

"مولوی نیاز احمد نیاز تخلص کہ بندہ در ایام طالب علمی شان عالم وجاہت ایشان را دیدہ ملکہ چند روز میزان ہم از ایشان در جہان آباد خواندہ بود زبانی صادر دارد"[1]

حضرت شاہ صاحب نے سترہ سال کی عمر میں علوم ظاہری سے فراغت حاصل کی، اور انیس سال کی عمر میں حضرت مولانا فخر الدینؒ کے ہاتھ پر بیعت ہو کر علوم باطنی سے آگاہ ہوئے، اسکے بعد مولانا فخر الدینؒ کے حکم کے بموجب بریلی پہنچے اور مسجد بی بی کے جنوبی حجرے میں قیام فرمایا،[2] رامپور بھی گئے، جہاں حضرت

---

[1] ریاض الفصحا ص ۲۲۹، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۴ء [2] مسجد بی بی بریلی میں اب بھی موجود ہے، بی بی جی سے مراد نواب حافظ رحمت خاں والی روہیلکھنڈ متوفی ۱۱۸۸ھ کی بہن ہیں، جنھوں نے روہیلہ حکومت کے استیصال کے بعد یہ مسجد تعمیر کرائی تھی، اکبری مسجد، مسجد جہاں خاں، جامع مسجد اور مسجد نو محلہ کی طرح مسجد بی بی جی بھی مشہور ہے، اس میں ایک مدرسہ بھی قائم ہے جس میں دینیات کی تعلیم دیجاتی ہے۔

شاہ عبداللہ قادری کے دست مبارک پر بیعت کی، ان کی دختر بھی آپ سے منسوب تھیں، اس کے بعد پوری زندگی آپ نے بریلی میں گزاری،

حضرت شاہ صاحب کو حدیث نبویؐ میں خصوصی عبور حاصل تھا، جس کا درس وہ تمام عمر دیتے رہے، اس طرح اکابر صوفیہ کی طرح آپ علوم ظاہری اور باطنی دونوں ہی سے آگاہ تھے، گو آپ کے انتقال کو تقریباً سوا سو سال ہو چکے ہیں، لیکن آپ کی شہرت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، سلسلۂ چشتیہ میں آپ کی نسبت سے ایک ضمنی سلسلے کی ابتدا ہوئی جو نیازیہ کے نام سے مشہور ہے،

صوفی اور شاعر کا سفر ایک ہی مقام سے شروع ہوتا ہے، لیکن دونوں کی فکر اور مقصد سفر جدا ہوتا ہے، اگرچہ ہر شاعر کا صوفی اور ہر صوفی کا شاعر ہونا ضروری نہیں ہے، لیکن بہت سے صوفیہ شاعر بھی تھے، ان ہی میں حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بھی تھے، انھوں نے اپنی واردات اور محسوسات کو شاعری ہی کی زبان میں ظاہر کیا ہے، وہ خود کہتے ہیں:-

نیاز اعجاز عشق ست ایں سخن سنج و خوش پرگو ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ وگرنہ شعر بے لغزش لحب کو بقرار من

ان کا کلام تمامتر صوفیانہ خیالات اور قلبی واردات سے معمور ہے، غزل کے مروجہ مضامین کی طرف انھوں نے التفات نہیں کیا ہے، اور ان کی شاعری میں ابرو کا تصور بھی محراب حقیقت سے ہی عبارت تھا، اگر ان کے کلام کا مطالعہ دقت نظر سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری "پختہ شدم" سے شروع ہوتی ہے، "سوختم" میں پہنچکر نکھار آتا ہے اور "نسیان ماسوی اللہ" اور "اعراض من دون اللہ" سے سرفراز ہونے کے بعد راہ سلوک میں اس کی مراجعت شروع ہو جاتی ہے[1]، اس طرح انکی شاعری کی ابتدا و انتہا، عام صوفیانہ شاعری کی ابتدا و انتہا، سے افضل و ممتاز ہے،

در اصل ایک صوفی کے سفر کی ابتدا، اخلاص سے ہوتی ہے اور انتہا یقین کامل پر، صوفی خدا

---

[1] حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست ‌ ‌ ‌ ‌ خام بدم، پختہ شدم، سوختم (رومی)

کی ذات وصفات کی تصدیق اور معبودات باطلہ کی نفی کرتا ہے مگر اس وقت مخلوق سے اس کا رشتہ منقطع نہیں ہوتا، بلکہ نفس امارہ اس کو بغاوت اور فریب میں مبتلا کرنا چاہتا ہے، اس کے سینہ میں وسوسے پیدا ہوتے ہیں، دنیاوی لذتیں اپنی طرف کھینچتی ہیں، اس کی فکر اور اس کے عمل میں تضاد باقی رہتا ہے، خیر وشر کی اس کشمکش میں احکام الٰہی کی پابندی اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی منزل کی طرف قدم بڑھاتی ہے، اور وہ تصدیق سے گزر کر منزل توحید میں آجاتا ہے، اس کا اخلاص یقین سے بدلنے لگتا ہے، ریاضت ومجاہدہ کے ذریعہ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب اور باطن میں صفائی اور روشنی پیدا ہونے لگتی ہے، خلق سے اس کا رشتہ منقطع ہونا شروع ہو جاتا ہے، دنیا اسے سراب معلوم ہوتی ہے ؎

کس کام کی یہ ہستی موہوم کائنات — سیراب کب کرے تجھے دھوکا سراب کا

اور صوفی یہ محسوس کرتا ہے ؎

اپنا ہی کچھ تصرف اوہام ہے کہ ہم — چہرہ پہ حق کے پاتے ہیں پردہ نقاب کا

بتدریج وہ واجب تعالیٰ کے قریب ہوتا جاتا ہے، ریاضت ومجاہدہ، ذکر وفکر، تلاش وجستجو سے وجود ممکن سے دور کر دیتے ہیں، اور ایک وقت وہ آتا ہے کہ "درد سر حسن مجاز" رخصت ہو جاتا ہے ؎

اے دل ز سرت درد سر حسن مجاز — صد شکر کہ ایں درد سرت آمد و رفت

اب خلق سے یہ تعلق اور وجود واجب سے یہ قربت ایک ایسا اثر پیدا کرتی ہے جو اپنی جگہ خود ایک انعام ہے، اور جس کے فروغ کو عشق کا نام دیا گیا ہے، یہ اثر طالب حق کے قلب کو منور کر کے اس کی آرزو کو بڑھاتا اور اس کو پائے استقامت بخشتا ہے، اس وقت صوفی یہی کہتا ہے کہ

ای دیدہ چہ اندر نظرت آمد و رفت — کز دیدن او یک اثرت آمد و رفت

اس کے بعد یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ ذات مطلق کے جمال کا قلب کی آنکھوں سے مشاہدہ

کرتا ہے، اس پر ایک کیف وسرور چھا جاتا ہے، خلق سے بے نیاز ہو جاتا ہے، وہ بس حق ہی کو جانتا پہچانتا ہے، اسکے خیالات مشاہدے میں تبدیل ہو جاتے ہیں، وہ یقین کامل کی منزل میں پہنچ جاتا ہے، یہاں جو ٹھہر جاتے ہیں جذب وکیفیت میں ڈوب کر بیخود ہو جاتے ہیں، اور بالآخر کبھی دیوانے کہلاتے ہیں، کبھی دار پر چڑھتے ہیں، کبھی ترک دنیا کا لباس پہن لیتے ہیں، اور جو لوٹ آتے ہیں وہ سالک کہلاتے ہیں، حضرت جامیؒ کی زبان میں "ذوالعین وذوالعقل" ؎

ذوالعینی وذوالعقلی شہود حق وخلق — بایک دگر از ہر دو ترا موجود است

یہ وہ بندگان خدا ہیں جن کی نظر میں خلق بھی ہے اور مشاہدۂ حق بھی، یہ محبوبین کے مقام پر فائز ہوتے ہیں، جو عبدیت کا افضل ترین مقام ہے،[1]

حضرت شاہ نیاز احمدؒ کے دواوین میں ایک بھی شعر اس مضمون کا نہیں ہے جس میں نفس امارہ کی شورش اور کشاکش، اور اس کے نتیجے میں حق کوشی کی تعلیم وتلقین کی گئی ہو، ان کے دواوین میں ایسے اشعار چار چھ سے زیادہ نہیں ہیں، جن میں بے ثباتی عالم ہستی موہوم، مصائب دنیا اور انسانی بے بسی وبے اختیاری کے مضامین پیش کیے گئے ہوں، ان کی شاعری مشاہدۂ حق اور کیفیات عشق کی شاعری ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب انھوں نے شاعری شروع کی تو وہ صوفی کامل بن چکے تھے،

مندرجۂ ذیل اشعار میں ہمہ اوست کا مضمون ملاحظہ کیجئے ؎

حسن روے ہر پریرو عکسِ حسن روئے اوست — رنگ وبوئے گلشن خوبی ز رنگ بوئے اوست

ذات خورشید ست فی الواقع بہر ذرہ محیط — در صفات وذات ایں پیدا ونہاں ذات اوست

ہم وجوب وہم قدم ہم وصف امکان وحدوث — در نگاہ دیدۂ بینا ہمہ حالات اوست

چشم دل نیاز کہ تابان ست چوں صدف — از آب روشنی ودر بے بہائے اوست

[1] دیکھئے ڈاکٹر میر ولی الدین کا مضمون "انسانی زندگی کے تین مدارج" مطبوعہ آستانہ زکریا ملتان بابتہ اگست ۱۹۵۷ء

عین دریا است حبابم بنگاہ تحقیق
ورنہ ایں قطرہ چرا شورش دریا میکرد

نیاید در نگاہ تو بجز آں حسن بیرنگی
ہر جانب کہ بینی باشد آں دلدار منظورت

نیست جز ہستی حق پیدا و پنہاں در وجود
چشم دل بکشا و بنگر بے حجاب اے ہوشمند

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہ تا بماہی سب ہے ظہور تیرا

وحدت کے ہیں یہ جلوے نقش و نگار کثرت
گر ہے تری معرفت کو پاوے شعور تیرا

نیرنگیوں سے یار کے حیراں نہ ہو جیو
ہر رنگ میں اسی کو نمودار دیکھنا

سوائے ہستیٔ حق کے جو کچھ نظر آوے
یقیں جانو کر دیو خیال کی ہے کھوڑ

ازل سے لیکے ابد تک ہی ہے جو ہے سو ہے
بہ رنگ بحر رواں جس میں ہے نہ توڑ و جوڑ

اگرچہ میں سیر بتاں دیکھتا ہوں
ولے جلوۂ حق عیاں دیکھتا ہوں

یہ جو کچھ کہ پیدا ہے سب عین حق ہے
کہ اک بحر ہستی رواں دیکھتا ہوں

ازل سے ابد تک جو کثرت ہے پیدا
سو وحدت کا دریا عیاں دیکھتا ہوں

حقیقت بہرصورت ایک ہے، کثرت میں وحدت ہی کی جلوہ گری ہے، اس لیے طالب حق کثرت کے بجائے وحدت کا طلبگار ہوتا ہے، اس کی مستی "ساقی توحید" کے "نشۂ چشم" سے پیدا ہوتی ہے۔ لہذا اسے "احتیاج ظرف مے و جام" نہیں رہتی، وہ بس حق کو دیکھتا ہے، حق کو پہچانتا ہے اور راہ حق ہی میں سفر کرتا ہے، ایسی حق پرستی میں امتیازات و تفرقات معدوم ہو جاتے ہیں، چشم باطن بس "جلوۂ حق" کو ہی عیاں دیکھتی ہے، خواہ اس کا تعلق "سیر بتاں" سے ہو، مختصر یہ کہ صوفی صرف حق ہی کو جانتا ہے، تصوف کی یہ اساس جو کافی قدیم ہے، اپنی افادیت کے پیش نظر آج بھی قابل قبول اور قابل عمل ہے، فرقہ بندی اور عصبیت کے شکار سماج میں ایسی حق پرستی انسانی اخوت سے عبارت ہے، صوفیوں کی زندگی بھی اس کا نمونہ تھی، وہ اسلامی اخلاق کے نمونہ تھے، اور ان کی خانقاہوں میں بغیر کسی امتیاز کے خلق اللہ کی خدمت کیجاتی تھی،

کے دل ہر قسم کی نفرت سے خالی تھے، ان کی حق پرستی کسی امتیاز کسی تفریق کی متحمل نہیں تھی، وہ تو حق ہی کے لیے جیتے اور حق ہی کے لیے مرتے ہیں۔

از فرقہ ہائے تفرقہ بس منکریم ما
با جمع اہل جمع موافق تریم ما

بین اہل ایماں ہم شدہ وہم یار بیدیناں
بنائے کعبہ را ہم ساخت ہم دیر و کلیسا را!

درون سینۂ من رہ بسوئے خود آراست
نہ راہ کعبہ روم نے کلیسا و نہ کنشت

اگر تو دفتر اسلام و کفر پارہ کنی
یقیں شود کہ توکیں شیخ و برہمن ہمہ اوست

قید مذہب سبب سلب تجرد تا دید
دل بے قید ز گبر و مسلماں برگشت

گنجائش خیال طلسم جہاں کہاں
آنکھوں میں جس کی جلوۂ حق ہو بسا ہوا

ہیں یہ ادیان و ملل سب شاخہائے یک درخت
ایک جڑ سے ہیں یہ نکلی ڈالیاں سب پھوٹ پھوٹ

صنم کو پوجے برہمن حرم کو مانے شیخ
یہ دونوں ایک ہیں رکھوں کسے کسے دوں چھوڑ

منزل ہماری پاتے ہیں کب شیخ و برہمن
اسلام و کفر سے پرے اپنا مقام ہے

صوفیانہ شاعری کنۂ حق کا رمزی اظہار ہے، عشق اس کی روح ہے، یوں بھی شاعری کا عقل و خرد سے تعلق زیادہ قریب کا نہیں ہے، چہ جائیکہ صوفیانہ شاعری، جس کی بنیاد ہی عشق پر قائم ہے، کیونکہ صوفیانہ مسلک ہی عشق تخلیق کا نام ہو جس کا عمل تدریجی طور پر وصل و قربت کا سبب بنتا ہے، اصل میں عشق ہی سفر ہے، اور عشق ہی منزل، نظام عالم عشق کے ہی جذب باہمی پر قائم ہے، انسان عشق کا پتلا ہے، خانقاہ میں بھی اور دار پر بھی، عشق کے مدارج اس کی روحانی ترقی کے مدارج ہیں، عشق کی تکمیل کا نام ہی فنائیت ہے، بیہوشی، مستی، اور کیف مدام اس کے اسرار ہیں، قید تعینات سے آزادی، آئینۂ قلب میں سمندر کے جوش و خروش کا مظاہرہ عشق کے کرشمے ہیں، عشق ہی تہذیب نفس ہے اور عشق ہی مقصد حیات، عشق ہی منزل اول ہے اور عشق ہی منزل آخر، صوفیانہ شاعری میں عشق کا ہی تصرف ہے، حضرت شاہ نیاز احمدؒ نے عشق پر بار بار

اظہار خیال کیا ہے، یہ اشعار ان کے دواوین میں کافی اہم ہیں:

وضو بخون جگر کن بحکم مفتی عشق
کہ از خباثت حدثت صفائے ایماں نیست

حسن خود عاشقست و خود معشوق
بر در نیاز خود نیاز منست

دفتر دعوی تقدیس ملایک یکسر
شعلۂ آتش عشق دل انسانم سوخت

کافر عشق ز رسم و رہ ایماں برگشت
محو نظارۂ جاناں ز دل و جاں برگشت

نظر اہل نظر منتج کثرت شہود
صوفی صافیم از حجت و برہاں برگشت

عاشقاں را سوئے جاناں عشق رہبر کامل ست
عاشق از صادق بود منزل بمنزل بگذرد

گرفت آتش عشقت ز فرق تا بقدم
ز آب پاست ہم چشم تر دریغ دار

علم رسمی درکنار انداز و گیر از دل سبق
نکتۂ عشقت کند حل بحث و تکرار دگر

مست گشتم از دو چشم ساقی پیمانہ نوش
الفراق اے ننگ ناموس الوداع اے عقل و ہوش

زہد و تقوی درفگندم زیر پائے آں صنم
نہ ہم عشقت و رندی مسترم جوش و خروش

زاہدا بشنو خدارا انچہ میگویم ترا
زہد بے معنی گذار و جام عشق از من بنوش

پرتو مہر قدیم است ایں مہ تابان عشق
جلوۂ نور کلیم است آتش سوزان عشق

دود آہ سرکشی از سینۂ سوزان من
مد بسم اللہ باشد بر سر دیوان عشق

شمع و پروانہ ہم دارند ربط عاشقی
نیک سنجیدیم سوز ہر دو در میزان عشق

در حریم وصل جاناں درنہادم چوں قدم
ہستیم را کرد بیروں از درش دربان عشق

دارد آزادی ز تقیدات وہمی بے گماں
ہر کہ دارد پائے در زنجیر در زندان عشق

کافر عشقم مپرس از دین من اے ہمنشیں
عشق اسلام ست و دیں در ملک کفرستان عشق

فارغ از رسم و رہ گبر و مسلماں ساختہ
مرحبا صد مرحبا بر لطف و بر احسان عشق

کشتۂ شمشیر عشق از مرگ باشد در اماں
زندۂ جاوید باشد مردۂ بیجان عشق

بوصل آرام جاں نہ در فراق آسودگی
از کہ جویم چارۂ ایں درد بیدرمان عشق

آب حیواں مرگ باشد در مذاق عاشقاں
زندۂ جاوید ہستند ایں کساں از جان عشق

گرچہ یک آسان عشق آساں کند صد مشکلم
لیک مشکل تر ز صد مشکل بود آسان عشق

چشم ادراک خرد را بہرہ نبود نیاز
از تماشائے کہ بیند دیدۂ حیران عشق

نیاز از رتبۂ عقل و خرد ہرگز مپرس از من
کہ ہر دم مستی از چشم سرشار آرزو دارم

عشق اسلام است و دینم عشق در ما در نست
عشق غمخوار ست و مونس عشق یار غار من

نیست جز آہنگ عشق آواز موسیقار من
رب ارنی می نوازد بربط ہر تار من

شہید اکبر ست ایں کشتۂ عشق
دعا للزہد و التقوی لمجنون

شاہ عشق آمد شد تخت نشیں بر من
شحنۂ عقل بدر شد ز حد کشور من

معیار عشق پہ زر ہمت لگا کے دیکھ
پکا جو ہے طلائے کسوٹی کسا ہوا

جو ہیں آمد آمد عشق کا مجھے دل نے مژدہ سنا دیا
خرد و حواس و شکیب نے وہیں کوس کوچ بجا دیا

جسے دیکھنا ہی محال تھا نہ تھا اس کا نام و نشاں کہیں
سو ہر ایک ذرے میں عشق نے ہمیں اس کا جلوہ دکھا دیا

جبھی جا کے مکتب عشق میں سبق مقام فنا لیا
جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے سو وہ صاف دل سے بھلا دیا

مدرسے میں عاشقوں کے جس کی بسم اللہ ہو
اس کا پہلا ہی سبق یار و فنا فی اللہ ہو

عالم عشق کی دنیا ہی نرالی دیکھی
سحر و شام وہاں یہ سحر و شام نہیں

کہتے ہیں عشق جس کو ہمارا ہی نام ہے
شور و فغاں کی اپنے یہاں دھوم دھام ہے

ہوش و خرد سے ہم کو سروکار کچھ نہیں
ان دونوں صاحبوں کو ہمارا سلام ہے

منزل ہماری پاتے ہیں کب شیخ و برہمن
اسلام و کفر سے پرے اپنا مقام ہے

سوجھے نہیں دن رات تمہے دھیان میں پیا کے
اپنی تو سحر ہے یہی اور شام یہی ہے

جب عشق روح کی گہرائیوں میں سما جاتا ہے تو مقام قربت حاصل ہوتا ہے، اب صرف محبوب ہی باقی رہ جاتی ہے، ورنہ صوفی تو خاک ہو چکا ہوتا ہے ؎

شعلۂ نور قدم بر دلِ طورم تابید
سوختم خاک شدم سوزشِ جانم باقیست

اس وقت اس کی نظر میں رنج وراحت اور دوزخ وبہشت کا مفہوم باقی نہیں رہتا ہے ؎

ز رنج وراحتِ ہستی گذشتہ در جائے
رسیدہ ام کہ در آنجا نہ دوزخ است و بہشت

فارغ از سود و زیانِ دین و دنیا گشتہ ام
عاشق عہدیدہ را سود و زیانِ دیگر ست

تعینات کے پردے اٹھ جاتے ہیں اور بعد مکانی و زمانی باقی نہیں رہتا ہے ؎

دیوانگانِ بادیہ پیمائی عشق او
ہفت آسمان بچشم زدن زیر پا کنند

اور صوفی صرف طالب دیدار حق ہو جاتا ہے ؎

مبارک رہے تجھکو واعظ بہشت
یہاں ہم تو طالب ہیں دیدار کے

اس کے اطوار واوضاع بھی بدل جاتے ہیں ؎

عشق بازان حقیقت راست از سر تا قدم
راہ و رسم دیگر و اوضاع و اطوار دگر

اور وہ رقص کرنے لگتا ہے ؎

در شوق جمال او یکدل شدۂ دیگرد
لا واحد الا ہو میگویم و می رقصم

اس وقت وہ آرزو کرتا ہے ؎

اعجاز نگاہ تو کند زندۂ جاوید
اے رشک مسیحا بمن انداز نگاہی

یہ وہ سطح ہے جو عام سطح سے بلند ہے کیونکہ اس کا حصول تکمیل عشق کے بعد ہوتا ہے، لہذا ایک صوفی اور عام انسانوں میں عشق ہی وجہ امتیاز بنجاتا ہے ؎

جسم وجانِ کاملاں نبود مثالِ ناقصاں
عاشقان و عارفاں را جسم و جاں دیگر ست

گویا عشق کامل انسان کامل کی تصویر ہے، انسان کامل سے مراد عبدیت کا وہ مقام ہے جہاں پہنچکر اسرار الٰہی منکشف ہو جاتے ہیں، حجابات وتعینات کے تقیدات ختم ہو جاتے ہیں، انسان نئے سرے سے تخلیق ہوتا ہے، اور جہان آب وگل اس میں سما جاتا ہے، وہ نہ زمان کا پابند ہوتا ہے اور نہ مکان کی قید اس کی پرواز میں حائل ہوتی ہے، زمانے کا تسلسل ختم ہو جاتا ہے، اور وہ ایک "ابدی اب" بنجاتا ہے
ایسے انسان کی رفعت کا کیا ٹھکانہ —

جلوہ گاہ ذات ہیں در منظر ایوانِ دل
عرشِ سلطان وجوب ہیں کرسی امکان دل

دریائے محیط ست وجودم بحقیقت
در صورت خود گرچہ بتمثال سرابم
سلطان جہاں ہستم و آزاد ز ہر قید
گو شکل گدایانہ بقید گل و آسم

صورتم بست ست لیکن معنیِ دارم بلند
باطنم آزاد مطلق ظاہرم در قید و بند

من آں نورم اندر لامکاں موجود بودستم
باشراق خودم خود شاہد مشہود بودستم
نہ از عالم بیانہ بود نہ آدم نشانی داشت
کہ از نظارہ حسن خودم خود دیدبود ستم
بسیطم آں قدر شد منبسط از جہت پیدائے
کہ با یک نقطگی صد با خط ممدود بودستم
بدریائے حقیقت ہر غواصان دریا دل
بہر عہدے و عصرے گوہر مقصود بودستم
نیاز اندر حقیقت لایزال ولم یزل ہستم
مگر با ایں تعین نیست و نابود بودستم

من پاکباز عشقم ذوقِ فنا چشیدہ
آہوئے دشت ہویم از ماسوا رسیدہ
من نور ذات حقم اے صاحب بصیرت
در صورتم اگرچہ از خاک آفریدہ
من جلوہ گاہ ذاتم ہم مظہر صفاتم
ہم اصل کائناتم از نورش آفریدہ

ملکِ خدا میں یارو آباد ہیں تو ہم ہیں
تعمیر دو جہاں کی بنیاد ہیں تو ہم ہیں

دیکھا پرکھ پرکھ کر آخر نظر پڑا یہ
گر نقد ہیں تو ہم ہیں نقاد ہیں تو ہم ہیں

اپنا ہی دیکھتے ہو تم بند و بست یارو
گر داد ہیں تو ہم ہیں فریاد ہیں تو ہم ہیں

پھیلا کے دام الفت گھرتے گھراتے ہم ہیں
گر صید ہیں تو ہم ہیں اور شاد ہیں تو ہم ہیں

شادی و غم یہ دونوں اپنی ہی حالتیں ہیں
دلگیر ہیں تو ہم ہیں صیاد ہیں تو ہم ہیں

کاریگری کی اپنی یہ سب مصوری ہے
تصویر ہیں تو ہم ہیں بہزاد ہیں تو ہم ہیں

ہستی کے کاغذوں پر اپنے ہی دستخط ہیں
گر فرد ہیں تو ہم ہیں اور صاد ہیں تو ہم ہیں

جو کچھ کریں گر ٹھٹ ہر سو ہے ہوتی اپنی
فولاد ہیں تو ہم ہیں حداد ہیں تو ہم ہیں

ڈٹے زمیں کے اوپر مانند گرد بادی
گر خاک ہیں تو ہم ہیں ابراد ہیں تو ہم ہیں

تعلیم اور تعلم سب ہے نیاز اپنا
شاگرد ہیں تو ہم ہیں استاد ہیں تو ہم ہیں

صوفیانہ شاعری اور غزل میں قریب کا رشتہ ہے، کیونکہ غزل کی زبان میں متصوفانہ نکات کو پیش کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، غزل کی تکنیک اور اس کی اشاریت میں اس قدر لوچ اور ہمہ گیری ہے کہ وہ صوفیانہ مضامین کو قلب کی گہرائیوں میں اتار سکتی ہے، اردو و فارسی شاعری میں بکثرت ایسا کلام موجود ہے جس میں غزل کی زبان کے پیرائے میں تصوف کے رموز و نکات پیش کیے گئے ہیں، ان میں لطف غزل بھی ہے اور متصوفانہ مضامین کا رچاؤ بھی، ایسی ہی شاعری میں "حسن خوباں"، "حق بینی" کا ذریعہ ہے ؎

حسن خوباں بہر حق بینی مثال عینک است
مید ہد بینائے اندر دیدۂ نظارۂ من

چنانچہ صوفیانہ مضامین کو غزل کی زبان میں پیش کرنا، صوفی شعرا، کی سنت پر عمل کرنا اور اس سے گریز بہت کچھ لطف شاعری سے محرومی کے مترادف ہے، حضرت شاہ نیاز احمد صرف تصوف کے شاعر ہیں، انھوں نے صوفیانہ مضامین کے اظہار کے لیے غزل کے ڈھانچے میں رنگ تصوف بھرا جو قلوب، فکر انگیز اور دلآویز ہے، لیکن ان تصویروں میں تغزل کی خوبیاں نہ ہونے کے برابر ہیں جسے محسوس کیے بغیر رہا نہیں جاتا۔

ہمارے خیال میں اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے تصوف کے رموز و اسرار کے بیان کے لیے جس کے وہ زبردست واقف کار تھے، بے تکلف اور براہ راست طریقہ اختیار کیا اور غالباً یہ سب ارادۃً ہوا کیونکہ ان کے کلام میں ان کی بزرگ شخصیت ابل رہی ہے، چنانچہ ہمیں حضرت شاہ صاحبؒ کو اولاً ایک جید صوفی کی حیثیت سے ہی یاد رکھنا ہوگا، ان کی شاعری ان کے کمال کا اظہار ہے، لیکن ان کا کمال ان کے صوفی ہونے ہی میں پوشیدہ ہے۔

عبث ہے شعر و سخن کے یہ توڑ جوڑ نیاز
بس اپنے ذکر کی اور فکر کی طرف منہ موڑ

حضرت شاہ نیاز احمد نیاز کے دو دواوین مختصر ہیں، فارسی دیوان صرف اکتالیس[۴] صفحات پر اور اردو دیوان انیس[۹] صفحات پر مشتمل ہے، فارسی دیوان میں غزلیات کے علاوہ تین سو مثنویات، تین مستزاد، چند مناقب اور ایک مناجات ہے، اردو دیوان میں غزلیات کے علاوہ "آغاز ہولی" اور "پھاگ" پر بھاشا میں اشعار ہیں، جن کا سرگم صوفیانہ ہے ؎

من دھن مرلی موہن کی سدھ بدھ سب بسرانی
سکھی سہیلی سنگ کی کھیلی تمھیں پرت پہچانی

ہر مورت میں نیاز کو جانوں ایسی مت بورانی
پیت کی ریت کیا ہی ہوت ہر سانچ کھو گرگیانی

امنگو جوبنوا کیسے رکھوں سنبھار
امو ا بورے ٹیسو پھولے برن برن کی بہار

آیا پھاگن موری کھیلیں ترنی باری بال
ہمرے میت کو تو اکتو دیہو منہ پیار

یہ دونوں دواوین بقامت کہتر اور بقیمت بہتر کے مصداق ہیں، تمام کلام اعلیٰ صوفیانہ مضامین سے لبریز ہے ؎

نکہ ہر کس نرسد نقد سخن را اے دل
نگہ شیشہ گراں کو دکجا گوہر ما

حضرت شاہ صاحبؒ کے دیوان کے ایک جدید اڈیشن میں جو موجودہ سجادہ نشین خانقاہ نیازیہ کے زیر اہتمام چھپا ہے، ایک سادہ سی غزل، غزل کی زبان میں بھی ہے، خانقاہ نیازیہ کے ذخیرۂ نوادرات میں تھوڑا عربی کلام[1] مزید محفوظ ہے، جو زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا، ہمارے خیال میں حضرت شاہ صاحبؒ اصلاً زبان فارسی کے شاعر تھے، انھوں نے اردو میں جتنا بھی سرمایۂ شاعری چھوڑا، ان کے عہد کا وہ بہترین سرمایۂ شاعری ہے، ہم ان کی غزل کو بطور سند پیش کر سکتے ہیں۔

حضرت شاہ نیاز احمد نیازؔ کا انتقال ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء بریلی میں ہوا، اور وہیں آپ محلہ خواجہ قطب میں دفن ہوئے، آپ کا مزار مرجع عوام ہے۔

زیارت گاہ عالم آج ہے یاں دو مزار اپنا

کہو حاسد کو تو بھی ساتھ میرے اب یہاں لڑ آ

---

[1] ہمارے فاضل دوست جناب ایوب قادری نے اپنی کتاب مولانا فیض احمد بدایونیؒ میں مولوی عبدالقادر بدایونی کی کتاب تحفۂ فیض کے حوالے سے حضرت شاہ نیاز احمد نیازؔ کو عربی شاعری میں مولانا فیض احمد بدایونی کا شاگرد بتایا ہے، ہمیں یہ بات ماننے میں تامل ہے، مولانا فیض احمد بدایونیؒ کی پیدائش ۱۸۲۸ء میں ہوئی، یعنی اس وقت نیازؔ کی عمر ۸۶ سال کی تھی، اس کے بعد جب مولانا فیض احمد بدایونیؒ شعر گوئی کے سن و شعور کو پہنچے تو وہ حضرت نیازؔ کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا، عمر کے اس تفاوت سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نیازؔ نے مولانا بدایونیؒ سے عربی اشعار میں اصلاح کے لیے رجوع نہیں کیا، جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے حضرت شاہ نیاز احمد نیازؔ نے فارسی، اردو، عربی شاعری میں صرف اپنی فکر کو رہنما بنایا، اور کسی ہمعصر کے آگے زانوئے شاگردی تہ نہیں کیا۔

اَنَا عَلَمِیَّہ وَ اَدَبِیَّہ

خطوط اکبر الہ آبادی مرحوم

بنام

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

الہ آباد ۲۹ اگست ۱۹۲۱ء

میرے مکرم

اللہ آپ کو مسند ہدایت و ارشاد پر متمکن رکھے، ناتندرستی اور عمر نے اب مجھکو نشاطِ طبع سے قریباً بالکل بیگانہ کر دیا ہے، پچھلے خط میں آپ نے داد دیکر ذرا دل بڑھایا تھا،

آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے لیکن کیا کروں، خواجہ حسن نظامی صاحب اگرچہ بہت محبت وارادت سے مجھ سے ملتے ہیں لیکن میں ان کی تصنیفات میں ان کا مشیر و معین نہیں ہوں، نہ اس میں میری منظوری شامل ہے،

میں یہ سمجھتا ہوں کہ مسئلہ خلافت اور تنظیم درویشی میں خواجہ صاحب پکے سنی ہیں، خواجہ صاحب آنے والے ہیں، ان سے گفتگو کروں گا، اس کے متعلق کچھ اور باتیں ہیں، زندگی ہیں آپ ملے تو عرض کرونگا، ۱۰ دن سے میں بہت بیمار ہوں، غذا ترک ہے، آج صبح تو بالکل مایوسی تھی، عشرت سلمہ کے پاس قاصد خاص روانہ کیا ہے، بہرحال زندگی کچھ باقی ہے بھی تو جان نہیں ہے

ہوش میں لائی ہیں اب مایوسیاں نشۂ امید فردا ہو چکا

انگریزی حکام کے خطوط آتے ہیں، معذرت کرنا پڑتی ہے۔

اکبر

الہ آباد، ۱۲ مارچ ۱۹۲۱ء

آپ کو خبر نہیں، آپ صاحبوں سے مجھکو کیا دلی تعلق ہے، بیماری اور ضعف نے قریباً بربستر کر دیا ہے، معارف بھی نہیں آیا، کیا آپ کا تعلق نہیں رہا، اور عزیز بھی تو ہیں، ماجد میاں کہاں ہیں؟ شوق خط بھیجکر خاموش رہے، اکثر اشعار قابل اشاعت پڑے ہوئے ہیں، سب عزیزوں کو دعا۔

طالب دعا

اکبر

الہ آباد، ۱۹ اپریل ۱۹۲۱ء

عزیز مکرم سلمہ اللہ تعالیٰ

افسوس ہے کہ سفر یورپ سے آپ کی تندرستی کو کچھ فائدہ نہ پہنچا، آپ کی صحت و سلامتی کیلیے دعا کرتا ہوں، آپ نے لکھنؤ میں کب تک قیام کا قصد کیا ہے، اشعار اس قدر مختلف المضامین ہیں کہ انتخاب کا فیصلہ دشوار ہے، کاش آپ سنتے اور انتخاب کرتے، بہر کیف چند اشعار انشاء اللہ بھیجدوں گا، لیکن کہاں بھیجوں، اگر یہ لکھیے تو بہتر ہے، کہ کس مطلب و پرتو کے اشعار ہوں،

بہت اچھا ہے کہ ماجد میاں عرفان و طریقت کے خیالات میں محو ہیں، میرا ایک مطلع ہے

ہوا بد لگی ہے ایسی کچھ اس زمانے کی — دعائیں مانگتا ہوں ہوش میں نہ آنے کی

ایک شعر اور یاد آیا

مزا بھی ملتا ہے دنیا سے دل لگانے میں — سزا بھی ملتی ہے دنیا سے دل لگانے کی

میں علیل ہوں، نہایت تکلیف دہ امراض کا سامنا ہے، ۲۵ - ۳۰ مرتبہ چوکی پر جانا ہوتا ہے، سفر دشوار ہے،

لیکن خیریت ہے کہ زندگی کا آرزومند نہیں،

اکبر حسین

برادرم سلمہ اللہ تعالیٰ

اچھا کیا آپ نے ابھی وہ نظم "رحماء بینہم" شائع نہیں کی، دو چار مہینے التوا ہی بہتر ہے، ہیجان نفسانیت و بدگمانی ذرا کم ہولے، اگرچہ وہ نظم نہایت بے گناہ ہے،

بہت کچھ آپ کو لکھتا، مگر توانائی نہیں ہے، احباب کا شدید تقاضا مجبور کر رہا ہے، ورنہ چاہتا ہوں کہ مفقود الخبر رہوں،

ہماری شاعری کا مزا تو آپ کے استاد مرحوم کے دم کے ساتھ تھا،

اس سے پچھلے پرچے میں "کیا یہ علوم ہمارے لیے مفید ہیں" (جو نہایت عمدہ مضمون انگریزی کا ترجمہ ہے) کارینٹر میں ایک مختصر ریویو لکھتا ہوں، ختم ہو گیا تو بھیجدوں گا۔

ستارۂ صبح بند ہو گیا، یہ لطیفہ ذہن میں آیا کہ ابراہیم اس سے بھی مطمئن نہیں،

وجاہت حسین صاحب کا خط آیا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں ہم لوگوں پر کیسا نازک وقت ہے۔

اکبر

الہ آباد

برادرم

خط لکھنے کے بعد آپ کے عنایت نامے پر نظر پڑی، دردمند سلیمان دیکھکر دل بے چین ہو گیا، ہرچند چاہا کہ پھر اس کا خیال نہ آئے کیونکہ تکلیف ہوتی تھی، لیکن ابتک وہ کھٹک دل میں ہے، آج معارف پہنچا، اللہ تعالیٰ نے آپ کے دماغ و قلم کو ادھر متوجہ کیا، آپ کی تحریر سے زیادہ مستند

کون چیز ہوسکتی ہے، لیکن افسوس بھی ہوا کہ آپ نے ایسی زحمت گوارا کی، ادھر دو تین برس کا کلام دیکھئے تو زیادہ اظہار رائے کا موقع ملے، لیکن وہ ہنوز شائع نہیں ہوا، اس کی طلب بہت ہے، زمانۂ پرآشوب نے مجھکو خاموش کردیا، ممکن ہے اس کا بڑا حصہ نذر معارف کروں،

کبھی آپ سے ملنا ہو تو بہت کچھ کہوں سنوں، بعض ضروری باتیں ہیں، اس وقت ہوم رول عجب پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اپنی خیریت لکھیے۔

آپ کی محبت کا شکر گذار

اکبر

میرا تعلق دنیا سے قریبًا بالکل ہی جاتا رہا، مروت سے بہ تکلیف شریک بزم ہستی ہوں، حواس سے بھی مجبوری ہے،

ساتھی تھے جو رنج وراحت کے اس موت کے ہاتھوں چھوٹ گئے،

اب یاس گرائے دیتی ہے سب دل کے سہارے ٹوٹ گئے

مکاتیب شبلی

(حصہ اول و دوم)

مولانا مرحوم کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ، جس میں مولانا کے قومی خیالات اور علمی، تعلیمی اور ادبی نکات ہیں، یہ درحقیقت مسلمانوں کی تیس ۳۰ برس کی تاریخ ہے۔

ضخامت حصہ اول: للعہ حصہ دوم قیمت ۶/ ۴/

منیجر

مطبوعات جدیدہ

تفاسیر ابومسلم اصفہانی۔ از سید نصیر شاہ و رفیع اللہ صاحبان صفحات ۱۸۷، کتابت وطباعت متوسط، ناشر ادارۂ ثقافت، لاہور، قیمت ؏

ابومسلم اصفہانی تیسری صدی کے مشہور معتزلی مفسر ہیں، اگرچہ زمخشری کی طرح ان کی تفسیر متداول تو نہ ہوسکی، مگر تمام ہی مفسرین نے ان کے اقوال سے اعتنا کیا ہے، خاص طور پر امام رازی ان کی تفسیری رایوں کے بڑے شیدائی ہیں، امام رازی نے ان کی جو تفسیری رائیں کہیں بغرض استدلال اور کہیں بغرض استفادہ نقل کی ہیں، ان کو مولانا سعید انصاری مرحوم سابق رفیق دارالمصنفین نے جمع کردیا تھا، جو کتابی شکل میں آج سے چالیس سال پہلے دارالمصنفین سے شائع ہو چکی ہے، اب ابومسلم کی ان ہی رایوں کو ادارۂ ثقافت کے دو اہل قلم نے اردو کا جامہ پہنایا ہے، مگر افسوس ہے کہ اس موضوع پر جو کام چالیس سال پہلے ہو چکا ہے اس کا علم ان حضرات کو نہیں ہوسکا، اور وہ یہ جملہ لکھنے پر مجبور ہوئے "معلوم ہوا کہ کوئی ابوسعید انصاری نے اس سے پہلے یہ اقوال جمع کئے تھے"۔ حالانکہ یہ سعید انصاری صاحب کم ازکم بیس برس اسی لاہور میں رہے ہیں، اور اہل علم کے تمام حلقے ان سے واقف ہیں، ابھی دو سال پہلے ان کا انتقال ہوا ہے،

اگر یہ حضرات دارالمصنفین کی اس پیش کش سے واقف ہوتے تو ان کا یہ کام اور مکمل ہوتا، اس لئے کہ ایک دو نہیں بلکہ تقریبًا دس بارہ سورتوں کے بارے میں ابومسلم اصفہانی کی رائیں ان کے انتخاب میں نہیں آسکی ہیں، بہرحال ادارۂ ثقافت نے اسے شائع کرکے ایک علمی و دینی خدمت انجام دی ہے،

تاریخ شیر شاہی۔ از عباس خاں شروانی، ترجمہ مظہر علی خاں ولا، ترتیب ڈاکٹر سید معین الحق

صفحات ۱۵۶، کتابت و طباعت متوسط، ناشر سلمان اکیڈمی حق نشان نمبر ۳۰ نیو کراچی،
ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۲۵۔

اگر یہ کہا جائے کہ مغلیہ خاندان نے ہندوستان کو تمدنی و تہذیبی حیثیت سے جو کچھ عطا کیا ہے، اس کی بنیاد شیر شاہ سوری نے رکھی تھی، تو غلط نہ ہوگا، شیر شاہ نے ۵ برس کی مدت میں رفاہ عام کے جو کام کر ڈالے، اکبر نے اپنی نصف صدی کی حکومت میں اس سے کچھ ہی زیادہ کام کیا ہوگا، اس نظریہ سے اتفاق کرنا تو مشکل ہے کہ "آئین اکبری شیر شاہ کے مرتبہ قانون کا دوسرا نام ہے"، مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر ہمایوں اور اکبر کے درمیان شیر شاہ کا زمانہ نہ ہوتا تو اکبر کو شاید اتنی پائیدار حکومت حاصل نہ ہوتی،

شیر شاہ پر انگریزی اور اردو میں متعدد کتابیں موجود ہیں، مگر تاریخ شیر شاہی چونکہ عہد اکبری کی تصنیف ہے، اس لیے اس عہد کی تاریخ کا بہترین ماخذ ہے، اس کتاب کو آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے اردو میں منتقل کیا گیا تھا، مترجم مظہر علی خاں ولا فورٹ ولیم کالج کے متعلقین میں تھے، یہ کتاب بہت دنوں تک نایاب تھی، اب ڈاکٹر معین الحق صاحب نے اپنے مفید حواشی اور تصحیحات کے ساتھ اسے دوبارہ شائع کیا ہے، ترجمہ کی زبان چونکہ سوا ڈیڑھ سو برس پہلے کی ہے، اس لیے اکثر جگہ مفہوم کے سمجھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے، اگر یہ کتاب فارسی متن کے ساتھ شائع کی گئی ہوتی تو تحقیق کرنے والوں کے لئے زیادہ مفید اور قابل اعتماد ہوتی، بہرحال سلمان اکیڈمی نے اسے شائع کر کے ایک اچھی علمی خدمت انجام دی ہے۔

دو تذکرے (اول، دوم)۔ از کلیم الدین احمد، صفحات ۱۴۴۔ ۳۵۵، کتابت و طباعت بہتر، قیمت درج نہیں۔

۱۸ ہویں صدی میں فارسی زبان میں جو تذکرے اردو شعراء کے متعلق لکھے گئے ان میں دو مختصر تذکرے

تذکرۂ شورش اور تذکرۂ عشقی بھی ہیں، اب تک ان تذکروں کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی تھی، مشہور ناقد کلیم الدین احمد نے اپنے دوست و شاگرد جگت نرائن سہائے سے ان دونوں تذکروں کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں حاصل کیں، اور تصحیح کر کے ان کو شائع کیا، عام تذکروں کی طرح ان میں بھی شعراء کے حالات بہت ہی مختصر ہیں، البتہ بعض شعراء کے کلام کا انتخاب بہت طویل ہے،

عام طور پر دونوں تذکرہ نگار شعراء کے کلام پر کوئی نقد و تبصرہ نہیں کرتے، مگر میر کے تذکرے میں شورش کا قلم غالباً معاصرت یا کسی اور وجہ سے بہت تیز ہو گیا ہے، انھوں نے میر کی سیادت، ان کی زبان اور اخلاق ہر چیز پر تنقید کی ہے، صفحات ۹۰ - ۹۱ - ۹۲ - ۹۴ خاص طور پر مطالعہ کے لائق ہیں، بعض تنقیدیں گو سطحی ہیں مگر ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مرتب نے پہلے صفحے پر تذکرہ شورش کو اور دوسرے صفحے پر تذکرۂ عشقی کو جگہ دی ہے، ان تذکروں کو شائع کر کے کلیم الدین احمد صاحب نے ایک مفید ادبی خدمت انجام دی ہے۔

فوائد المریدین۔ از شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ ترجمہ شاہ قسیم الدین صاحب، صفحات ۱۱۰، کتابت و طباعت بہتر، ناشر بیت الشرف، خانقاہ بہار شریف۔

مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ ان بزرگوں میں ہیں جنھوں نے اپنے بعد اپنے ملفوظات، مکتوبات اور تصانیف کا ایک بیش قیمت اور ایمان افروز سرمایہ چھوڑا ہے، ان کے ان ہی متروکات علمیہ میں فوائد المریدین بھی ہے، اس میں شیخ نے اپنے متوسلین کیلئے عقائد، عبادات اور اخلاق و معاملات سے متعلق احادیث نبوی جمع کی تھیں، اور اسوۂ صحابہ اور بعض بزرگوں کے اقوال و افعال سے ان کی تشریح کی تھی، جا بجا شیخ نے اپنی طرف سے بھی تشریحات کی ہیں، جن کے پڑھنے سے ایمان و اخلاق میں جلا، اور روشنی پیدا ہوتی ہے، بزرگوں کی سادہ سادہ باتوں میں جو تاثیر ہوتی ہے، یہ کتاب اس کا بہترین نمونہ ہے، اصل کتاب فارسی میں تھی جس کا ترجمہ شاہ قسیم الدین صاحب نے کیا ہے، ترجمہ شستہ اور رواں ہے،

کتاب ہر مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے،

چراغ دیر و حرم
رقص طاؤس } از صفدر حسین صفدر، صفحات ۱۲۰ و ۱۲۳، کتابت وطباعت اعلیٰ، ناشر بارگاہ ادب ۵/۱۳۰۲ ڈرگ کالونی، کراچی ۲۵، شرودھانند اسکوائر ارجن روڈ کرشن نگر۔ لاہور:

ڈاکٹر صفدر حسین ایک پختہ مشق شاعر ہیں، وہ غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی، چراغ دیر و حرم انکی غزلیات کا اور رقص طاؤس ان کی نظموں کا مجموعہ ہے، ان کی غزلوں میں تغزل کی قدیم و جدید اور لفظی و معنوی دونوں طرح کی خوبیاں موجود ہیں، کلام میں پختگی، روانی اور برجستگی بھی ہے، اور ذہن رسا کے مشاہدات اور دل گداز کی کیفیات و واردات بھی ہر ہر غزل سے نمایاں ہیں، نظمیں انھوں نے زیادہ تر معرا لکھی ہیں، مگر وہ حسن معانی اور پاکیزگی تخیل سے معرا نہیں ہیں، امید ہے کہ ان کے دونوں مجموعے اہل ذوق کے قلب و دماغ کیلئے تسکین کا سامان فراہم کریں گے۔ کتابت وطباعت کلام کے شایان شان ہے، ان کے شان تغزل کا اندازہ ذیل کے چند اشعار سے بخوبی ہوجائے گا۔

اہل دل کوچۂ اصنام تک آ پہنچے ہیں — فاصلے عرصۂ دو گام تک آ پہنچے ہیں
جو بچ رہا ہو باقی وہی دیدے ساقی — بادہ کش دردِ تہِ جام تک آ پہنچے ہیں
ہائے وہ لوگ جو ہوں لذت آغاز میں گم — وائے وہ لوگ جو انجام تک آ پہنچے ہیں

آرائشِ جمالِ جہاں تاب کی قسم — میرے جگر کا خون بھی رنگِ سحر میں ہے
دل کانپ کانپ اٹھتا ہے منزل کے نام سے — صفدر کوئی فریب دلِ راہبر میں ہے

سکوتِ عشق اظہارِ تمنا اب بھی کرتا ہے — نگاہ ناز کی صرف لن ترانی اب بھی ہوتی ہے
چمن والوں کے آدابِ جنوں کا معجزہ کہیے — کہ دامانِ خزاں سے گل فشانی اب بھی ہوتی ہے

م ۔ ج

جلد ۹۴ ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۶۴ء عدد ۶

مضامین